معیاری ادب

انتخابِ ناسخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

س عرفان

معیاری ادب ۲۶

انتخابِ ناسخ

تصحیح و ترتیب
رشید حسن خاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

ستمبر ۹۳ء　　　تعداد 500　　　قیمت =/51

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) ۱۵۲۸۔ پٹودی ہاؤس دریا گنج۔ دہلی ۲

مجلسِ ادارت

حرفِ آغاز

پُرانی کتابیں کم یاب ہوتی جا رہی ہیں۔ جو کتابیں ملتی ہیں، اُن میں سے بیش تر قابلِ اعتبار نہیں۔ عام طور سے اُن کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور بہت سے لوگ جو اچھی کتابوں کو خریدنا چاہتے ہیں، قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے نہیں خرید پاتے۔

اِن امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، مکتبہ جامعہ نے، حکومتِ جموّں و کشمیر کے تعاون سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت قدیم معیاری کتابیں، صحتِ متن اور حُسنِ طباعت کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔ اِن کتابوں کا متن بہت اہتمام کے ساتھ تیار کیا جائے گا جو اُس کتاب کے معتبر ترین نسخے پر مبنی ہوگا۔ صحتِ متن کے ساتھ ساتھ صحتِ اِملا کا بھی بہ طورِ خاص لحاظ رکھا جائے گا۔ اور یہ ساری کتابیں آفسٹ پر نہایت خوب صورتی کے ساتھ چھاپی جائیں گی۔ اس کے باوجود اِن کتابوں کی قیمتیں کم سے کم ہوں گی اور اس کے لیے مکتبہ جامعہ حکومتِ جموّں و کشمیر کا ممنون ہے جس کی مالی امداد نے اس بات کو ممکن بنایا۔

ہمیں امید ہے کہ حکومتِ جموّں و کشمیر کی مالی امداد سے مرتب کیا ہوا کتابوں کا یہ سلسلہ اُردو زبان و ادب کے فروغ میں اور اچھی کتابوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت میں بے حد معاون ثابت ہوگا۔

شاہد علی خاں
(جنرل منیجر)

لکھتے ہی اُڑتے ہیں اطرافِ جہاں میں اپنے شعر
طائرِ معنی کو کاغذ، شہپرِ پرواز ہے

(ناسخ)

تعارف

انتخاب ناسخ کے اِس طویل تعارف کے لیے، کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ ناسخ، دبستانِ لکھنؤ کے سب سے پہلے اور سب سے اہم شاعر ہیں۔ اُنھوں نے ایک نئے اسلوب کی تشکیل کی تھی، جس نے دبستانی اسلوب کی حیثیت سے فروغ پایا اور مدت تک غزل پر اپنے نشانات کو نمایاں رکھا۔ بلکہ صحیح معنی میں یوں کہنا چاہیے کہ اِس اسلوب سے، غزل نے ایک نیا مزاج پایا تھا لیکن اِس اہمیت کے باوجود، ابھی تک اُن کی شاعری کا اِس طرح جائزہ نہیں لیا گیا، جس سے بحث کے سب گوشے روشن ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو اُن کی حقیقی شاعرانہ قدر و قیمت کا تعین نہیں ہو سکا۔ اور دوسری طرف اُن سے اُن باتوں کو منسوب کرنا روا رکھا گیا، جن کا ایک سرا مفروضات سے مل جاتا ہے۔ اِس میں سب سے اہم بحث، اصلاحِ زبان کی ہے۔

اِس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ناسخ کی شاعری، اور اُن سے منسوب اصلاحِ زبان کے مسائل پر اس طرح گفتگو کی جائے کہ مبہم باتیں، روشن ہو سکیں اور مفروضات کا دھندلکا، صاف ہو۔ یہ بہت مشکل ہے کہ کسی مقالے میں سارے مسائل اپنی جزئی تفصیلات کے ساتھ معرضِ بیان میں آسکیں۔ البتہ یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ مسائل کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اہم باتیں سامنے آجائیں۔ آیندہ کی مفصل بحثوں کے لیے، یہ مقالہ، ایک اہم اشاریے کا کام دے سکتا ہے۔

اِس مقالے کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ناسخ کی

شاعری کے پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ یہ حصّہ ، دو اجزا پر مشتمل ہے ۔

دوسرے حصّے میں ناسخ کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ یہ حصّہ ، آٹھ اجزا میں منقسم ہے ۔ پہلی فصل میں اسلوبِ ناسخ کے اہم اجزا کا تعیّن کیا گیا ہے ۔ دوسری فصل میں یہ بتایا گیا ہے کہ ناسخ کی شاعری ، خیال بند شعرا کے کلام سے مختلف ہے ــــ تیسری فصل میں کلامِ ناسخ میں تراکیب کے مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے ۔ چوتھی فصل میں ناسخ کے اُس حصۂ کلام سے بحث کی گئی ہے جس میں سادگی کی جھلک نظر آتی ہے اور جس کو اکثر لکھنے والوں نے اِس بات کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ ناسخ کے یہاں جذباتی شاعری بھی پائی جاتی ہے ۔ پانچویں فصل میں کلامِ ناسخ کے بعض اور اجزا کا ذکر کیا گیا ہے ۔ چھٹی فصل میں اس مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے کہ آج کلامِ ناسخ کی قدر و قیمت کیا ہے ۔ ساتویں فصل میں اِس پر بحث کی گئی ہے کہ ناسخ کی شاعری سے ملتا جلتا انداز جو بعض شعرائے دہلی کے یہاں بھی پایا جاتا ہے ، اُس کی حیثیت کیا ہے ۔ آٹھویں فصل میں مصحفی کے دیباچۂ دیوانِ ششم کی اُس عبارت کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں اُنھوں نے یہ کہا ہے کہ ناسخ نے ریختہ گویانِ سادہ کلام کے انداز پر خطِ نسخ کھینچ دیا ۔ اور یہ کہ میں نے اِس دیوان میں اکثر غزلیں اِسی انداز میں کہہ کر شامل کی ہیں ۔

تیسرے حصّے میں اِس پر بحث کی گئی ہے کہ زبانِ لکھنؤ سے کیا مراد ہے ۔ اور کیا اس سے ناسخ کی زبان مراد لی جاسکتی ہے ؟

چوتھے حصّے میں اِس غلط فہمی پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ ناسخ نے اصلاحِ زبان کے ضابطے بنائے اور متروکات کا تعیّن کیا ۔ یہ بتایا گیا ہے کہ متروکات کی جو فہرستیں آج ہمارے سامنے ہیں ، ان میں سے اکثر و بیشتر تلامذۂ ناسخ کے کارنامے ہیں ، مگر ان کو ناسخ سے منسوب کیا جاتا رہا ہے ــــ اِسی سلسلے میں اس پر بھی گفتگو کی گئی ہے کہ پابندیِ قواعد اور تعیّنِ متروکات کی تحریک جس تیزی سے لکھنؤ میں

مقبول ہوئی، دہلی میں یہ اُس طرح فروغ پذیر کیوں نہیں ہوئی۔ اور یہ کہ متروکات کے سلسلے میں اِس زمانے میں پھر شعرائے دہلی کے قدیم طرزِ عمل کی طرف بازگشت ہو رہی ہے۔

پانچویں حصّے میں نہایت اختصار کے ساتھ ناسخ کے بعض حالاتِ زندگی اور تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِس مقالے کا اصل مقصد شاعری اور اصلاحِ زبان کے مسائل پر تبصرہ کرنا ہے، اِسی لیے حالات کا حصّہ مختصر ترین ہے۔

چھٹے حصّے میں اِس شک کا اظہار کیا گیا ہے کہ ناسخ کے شاگرد رشک نے کلّیاتِ ناسخ کا جو غلط نامہ بنایا ہے، اس پر جگہ جگہ تصحیح کے بجائے، ترمیم کا گمان ہوتا ہے۔ اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اِن شکوک کے ازالے کے لیے، کلامِ ناسخ کے خطّی نسخوں کی مدد سے، کلّیاتِ ناسخ کی از سرِ نو تدوین ضروری ہے —— ساتویں حصّے میں مختصراً اِس انتخاب سے متعلق کچھ کہا گیا ہے۔

مجھے توقع ہے کہ اس مقالے سے بعض اہم مسائل کی وضاحت میں مدد ملے گی اور اس بنا پر اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ میں آخر میں یہ عرض کرنے کی اجازت بھی چاہتا ہوں کہ کسی بات کی بار بار تکرار سے، وہ زبانی ہو یا تحریری، یہ لازم نہیں آتا کہ وہ بات صحیح بھی ہو، یا اُسی طرح صحیح ہو۔ ناسخ کی شاعری اور تحریکِ اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ایسی ہی بعض باتوں کی تکرار کی گئی ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس تکرار سے قطعِ نظر کر کے، خود کلامِ ناسخ کی روشنی میں اِن مسائل کا جائزہ لیا جانا چاہیے، اور میری کوشش اِسی انداز کی ایک حقیر کاوش ہے، اِس لیے یہ درخواست بھی بے جا نہ ہوگی کہ اس پریشاں نگاری کو، اِسی زاویۂ نظر سے دیکھا جائے۔

پس منظر

نواب آصف الدولہ متوفی: ۱۲۱۲ھ = ۱۷۹۷ء (مفتاح التواریخ) کے زمانے تک زبان اور معاشرت پر دہلی کی روایتوں کا اور دہلی سے آئے ہوئے مہاجر شاعروں کا اثر نمایاں تھا۔ اگرچہ تبدیلی کی زیریں لہریں برابر کار فرما تھیں۔ دہلی سے آئے ہوئے شاعروں سے دربار، دیوان خانوں اور مشاعروں کی رونق بھی تھی اور عزت بھی۔ اُسی طرح جس طرح ایران سے آنے والے شاعروں کے وجود سے دہلی کی مغل سلطنت میں فخر و امتیاز کا بازار گرم رہا کرتا تھا۔ وہاں قابلِ ذکر ایرانی شاعر کا کسی امیر سے متوسل ہونا، خود اُس امیر کے لیے باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا، وہی صورت یہاں بھی تھی۔ اِسی لیے یہاں کسی نہ کسی مرحلے پر اُس ردِ عمل کا پیدا ہونا بھی ناگزیر تھا جو دہلی میں، آخری زمانے میں، ہندوستانی ایرانی شعرا کی معاصرانہ چشمکوں اور معارضوں کی صورت میں رونما ہوا۔

مغل حکومت میں، ایرانی شعرا کی قدر و منزلت کی دھوم تھی۔ دولت، عزت، شہرت اور ان سب سے بڑھ کر معیارِ اعتبار و استناد اُن کو حاصل ہوتا تھا۔ مقامی شاعروں کی اُن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ اہلِ زبان ہونے کے لحاظ سے اُنھی کی زبان مُستند تھی، باقی سب اُن کی تقلید پر مجبور تھے۔ خود ایرانی شعرا کو بھی اپنی اِس حیثیت کا سب سے زیادہ احساس رہا کرتا تھا۔ ہندوستانی شاعر خود بھی اپنے کو کم تر سمجھتے تھے، اُسی طرح جیسے کسی بڑے پیر یا پیرزادے کے سامنے باقی سب لوگ اپنے آپ کو حقیر فقیر سمجھتے ہیں۔ اِس فوقیت کی حیثیت آیت و حدیث کی سی تھی ــــ یہاں تک کہ خانِ آرزو نے اپنے علم و شہرت کے بل پر اس طلسم کو توڑا۔ شیخ علی حزیںؔ سے اُن کے معارضے کا حال سب کو معلوم ہے۔ اُس کی تہ میں یہی ردِ عمل کام کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس ردِ عمل نے

ایک روایت کی سی حیثیت اختیار کرلی۔ اگر فارسی زبان یہاں پہلے کی طرح حکمراں رہتی تو اس نئی روایت کے اثرات بڑے پیمانے پر اپنا اثر ضرور دکھاتے۔

آصف الدولہ کے آخری زمانے تک لکھنؤ میں ایک نئی معاشرت کا خاکا بننے لگا تھا، رنگ آمیزی بھی شروع ہو چکی تھی۔ اودھ کا علاقہ پناہ گاہ تھا، جہاں اُجڑے دیار کے لوگ آ آکر پناہ لیا کرتے تھے۔ آج اِس بات کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اُس زمانے میں لکھنؤ میں بھی کچھ لوگ اِس طرح ضرور سوچتے ہوں گے کہ جن لوگوں کو اس شہر نے پناہ دی ہے، روزی روٹی دی ہے، اور ان سب سے بڑھ کر ایک دربار اور کئی چھوٹی بڑی سرکاروں کی سرپرستی کی عزت بخشی ہے، اُن کو اِس شہر کا ممنون تو ہونا ہی چاہیے۔ درباروں سرکاروں کی سرپرستی اس زمانے میں بڑی چیز تھی، جس کی تمنا بلکہ حسرت، شاعروں کے دل میں رہتی تھی۔ یہ سرپرستی مالی منفعت سے زیادہ، تسکین کا آبِ حیات عطا کرتی تھی۔ لیکن معروف شعرائے دہلی نے پورب کے ساکنوں کو ہمیشہ اپنے سے کم تر سمجھا۔ پورب اور پورب کے ساکن گویا اصطلاحی لفظ بن کر رہ گئے تھے، جو اسی مفہوم کو ادا کیا کرتے تھے۔ مدح اور مجبوری کی بات تو دوسری تھی، ورنہ حقیقتہً یہاں کی زبان، نئے تہذیبی عناصر، اور یہاں کی قدر دانی، ہر چیز ان لوگوں کو سطحیت سے لب ریز دکھائی دیتی تھی۔ دہلی کا روایتی جاہ و جلال اور اُس کی تاریخی بے کرانی ہمیشہ نگاہوں میں بسی رہتی تھی۔ یہ نیا دربار اور یہاں کی سرکاریں، دولت و عشرت کی بہتات کے باوجود، اُس کے مقابلے میں تصور کی نگاہوں کو بہ ہر صورت کم درجہ دکھائی دیتی ہوں گی۔ اِس دربار کے پاس سب کچھ تھا، لیکن ماضی کی شان دار روایت کا وہ ورثہ بہ ہر حال نہیں تھا، جس سے عظمت کا نور دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور جس کی روشنی میں، شکستہ در و دیوار میں آثارِ صنادید کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔

ایک بڑی بات یہ بھی تھی کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی، یہ "آصف الدولہ وزیر"

کا دربار تھا، جس کو سندِ وزارت اب تک اُسی اُجڑے دیار سے ملا کرتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مدّت سے یہاں رہنے والوں کے مقابلے میں، یہ تازہ وارد لوگ اپنے کو صحیح معنی میں اہلِ زبان سمجھتے تھے۔ میرؔ و مصحفیؔ جب یہ کہتے ہیں کہ:

بعضوں کا گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں ؛ دلّی نہیں دیکھی ہے، زباں داں یہ کہاں ہیں
مصحفی

صحرائیانِ پورب کیا جانتے ہیں اس کو
اے مصحفی، جدا ہے انداز اس بیاں کا ″

کیوں نکلے دلّی سے لکھنؤ ہے خوب
نہ وہ کوچے ہیں یاں نہ وہ گلیاں ″

دلّی کہے ہیں جس کو زمانے میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا ″

خرابہ دلّی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا، سراسیمہ نہ آتا یاں
میر

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا
خریدار لیکن نہ پایا گیا ″
متاعِ سخن بھیر کرلے چلو
بہت لکھنؤ میں رہے، گھر چلو ″

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزمِ سفر ہنوز ″

یارب، شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے ویرانے میں لا مجھ کو بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت اے وائے، یہ کیا کیا خدایا تو نے
مصحفی

تو انھی سب احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ انشا، نواب سعادت علی خاں کے "ملازم" تھے۔ لیکن دریائے لطافت میں جب دہلی و لکھنؤ کا مقابلہ کرتے ہیں تو کوشش یہی کرتے ہیں کہ پردے پردے میں دہلی کی مرکزیت کا اور اُس کی برتری کا اِس طرح ذکر کریں کہ دہلویت کی جو نسبت نام کے ساتھ شامل ہے، اُس کا حق ادا ہو جائے۔

اِس احساس کا ردِ عمل ضروری تھا۔ ناسخ کی شاعری اور اُن کے نئے انداز نے لکھنؤ میں جو اس قدر جلد فروغ پایا اور اس ہمہ گیری کے ساتھ کہ وہاں باقی سب انداز منسوخ ہو کر رہ گئے، ادبی سطح پر یہ اسی ردِ عمل کا اظہار تھا۔ گویا اس نئی مملکت اور اس کی نئی معاشرت کو، جو تشکیل کے مراحل سے گزر رہی تھی، ادبی خود مختاری کا منشور مل گیا۔ دہلی کی تقلید سے، دہلی والوں کے احساسِ برتری سے اور صحیح معنی میں اُن کی خدائی سے پروانۂ نجات ہاتھ آیا۔ نئی حکومت، نئے سکّے کو بھی ضروری سمجھتی ہے۔ فارسی کے برخلاف، اُردو چوں کہ اس کے بعد بھی فرماں روا رہی، اس لیے دہلی و لکھنؤ کے اختلافات بڑھتے ہی رہے۔ آج تک اس کے اثرات کار فرما ہیں۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو ناسخ کی شخصیت اور ان کی تاریخی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں یہ بھی کہہ دوں کہ یہ بے انصافی ہو گی اگر ناسخ کی شاعری کو، غزل گوئی کے مسلّمہ معیار ہی سے جانچا جائے۔ یہ مسلّمہ معیار سراسر دہلوی ہے۔ ناسخ نے اس مسلّمہ معیار کے برخلاف ایک اپنا معیار بنانا چاہا تھا، جو دہلویت کا حریف بھی ہو اور نئی شاعری کا نقیب بھی۔ اِس بات کو ضرور پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ شاعری کے مسلّمہ معیار کے لحاظ سے ناسخ کی شاعری کی جو بھی قدر و قیمت ہو، لیکن اُن کے اپنے تشکیل کردہ معیار اور روایت کے

لحاظ سے بھی اُن کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین کیا جانا چاہیے۔
شجاع الدولہ کے آخری زمانے سے اودھ میں عیش کوشی کی طرف توجہ بڑھ گئی تھی۔ دولت تو تھی ہی۔ شجاع الدولہ نے آخری زمانے میں طوائفوں کی جس طرح سرپرستی کی تھی، اُس کا اثر عام لوگوں پر پڑنا لازم تھا۔ لیکن تلوار کی جھنکار کی بازگشت ابھی تک فضا میں لرزاں تھی۔ آصف الدولہ کے زمانے میں اس نئی معاشرت میں لذّت کوشی کے گہرے رنگ آمیز ہونا شروع ہوئے۔ یہ نئی زندگی، جس کی تشکیل خاص حالات میں ہوئی تھی، اب نفاست و لطافت کے عطرِ مجموعہ میں بس چکی تھی۔ تلوار کی جھنکار فضا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ عیش کوشی کی تمنا خون بن کر اُس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ تعیّش نے کاہلی، ہوس ناکی، نسائیت اور سطحیت کے فروغ کا سامان فراہم کرنا شروع کر دیا تھا۔ صناعی اپنی حدوں سے گزر کر تصنّع سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ملمّع کا یہ عالم تھا کہ ان سب پر مرقعِ آدابِ زندگی کا دھوکا ہوتا تھا۔ سچّے کام کی پھوٹ پڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔
آصف الدولہ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں مرحوم ہوئے۔ ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں اُن کے جانشین نوّاب سعادت علی خاں نے سفرِ آخرت کیا (مفتاح التواریخ) اس وقت تک لکھنؤ کی نئی معاشرت کا نقش درست ہو چکا تھا۔ لیکن ذہنی طور پر دہلی کی حکومت اور وہاں کی روایتوں کا کچھ نہ کچھ بھرم اب تک باقی تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ ناسخ استادی کا علم بلند کر چکے ہیں۔ اُن کو طرزِ کُہن کا ناسخ اور طرزِ نو کا بانی تسلیم کر لیا گیا ہے، لیکن وہ خود اپنے کلام میں جگہ جگہ میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کا نام احترام کے ساتھ لیتے ہیں ـــــ یہاں تک کہ نوّاب سعادت علی خاں کے جانشین، نوّاب غازی الدین حیدر نے ۱۲۳۴ھ ۱۸۱۹ء میں دہلی کی برائے نام بادشاہت سے قطع تعلق کر کے، خود بادشاہت کے تخت کو رونق بخشی۔ اصل میں یہ بھی انگریزوں کی تدبیرِ جہاں بانی کا ایک کرشمہ تھا، لیکن

اِس سے اُس نئی معاشرت کو بہت بڑا سہارا مل گیا۔ اب سیاست سے لے کر ادب تک ، ہر سطح پر ایک ممتاز انداز و وضع کے فروغ اور تکمیل کی ضرورت کا احساس اور تیز ہو گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ تصنع اور ساختگی کا رنگ ہر جگہ گہرا رہے۔

اِس کوششِ امتیاز کے علاوہ ، جس نے تصنع کو فروغ بخشا ، اس نئی معاشرت میں ایک بہت بڑا محرک مذہبی تھا۔ دہلی میں اورنگ زیب کے بعد ہی سے ایرانی و تورانی امرا کی کشمکش کھل کر سامنے آنے لگی تھی۔ مغل دربار میں ایرانی امرا کا طاقت ور گروہ موجود تھا۔ ہمایوں کی واپسیِ ایران کے بعد سے ایرانی اثرات کا بڑھنا ناگزیر تھا۔ اکبر و جہانگیر کے زمانے تک یہ اثرات اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ زبان ، ادب ، فنونِ لطیفہ اور معاشرت پر ایرانی جمالیاتی عناصر کا اثر غالب تھا، لیکن حکم راں طبقے کا نسب نامہ ایران تک نہیں پہنچتا تھا، ترکمانی عناصر اُس کے خون کا جُز تھے۔ اس لیے ترکمانی امرا زیردستی کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس احساس نے دہلی میں کشمکش کا سا عالم ہمیشہ رکھا۔ کبھی مجدد الفِ ثانیؒ کی تحریک کی صورت میں اس کا اظہار ہوتا تھا اور کبھی مرزا مظہر جانجاناں کی شہادت کی شکل میں۔

لکھنؤ کی اِس نئی حکومت کی محدود وسعت ، ایرانی اثرات کے بے تکلف پھیلاؤ کے لیے بہت سازگار تھی۔ کیوں کہ یہاں ایران و توران کی وہ کشمکش نہیں تھی ، نہ امرا کے مختلف گروہوں کی صورت میں ، نہ مذہبی ٹکراؤ کی صورت میں لیکن مشکل یہ تھی کہ (حالات) کے زیرِ اثر جو ایرانی اثرات اب یہاں کار فرما تھے وہ ایرانی عسکریت سے خالی تھے۔ جنگِ بکسر (۱۱۷۸ھ = ۱۷۶۴ء) کی شکست کے بعد، شجاع الدولہ نے تلوار ایک طرح سے رکھ دی تھی۔ اب ان کی زیادہ توجہ طوائفوں کی سرپرستی شہر کی رونق اور تعمیرات کی طرف مبذول ہوئی۔ اُن کے

جانشین، خاص طور سے آصف الدولہ، عزم و ہمت سے تہی دامن اور مجہول تعیش کے جذبات سے سرشار تھے۔ انھی کو فروغ بھی دیا۔ شجاع الدولہ نے مسندِ وزارت پر جلوس کیا تھا تلواروں کے سایے میں اور اُس جنگ جویانہ روایت کے سایے میں جو نواب صفدر جنگ اور نواب منصور جنگ کی یادگار تھی۔ آصف الدولہ نے رامش و رنگ کے دھندلکے میں اِس مسند پر جلوس فرمایا تھا۔ اُن کو ورثے میں تلوار کے بجائے، صرف عیش طلبی ملی تھی۔ انگریز نے اپنی روایتی دور بینی اور زیرکی سے رفتہ رفتہ اودھ میں اس قدر اقتدار بہم پہنچالیا تھا کہ اب زمین کے مالک تو نواب وزیر تھے لیکن زمین کی محافظ فوج کے مالک انگریز تھے۔ وہی تحفظ کے ذمّے دار تھے۔ انگریزوں نے اودھ کی آمدنی سے زیادہ وہاں کی عسکریت پر توجّہ مرکوز رکھی۔ آمدنی کو اس لیے باقی رکھا گیا اور اس قدر آمدنی کو ضروری سمجھا گیا جس سے حکم راں اور اس کے مصاحبین، عیش و عشرت میں دن رات گزار سکیں۔ اس میں کمی محسوس نہ ہو۔ محسوس یہی ہو کہ ملک ہمارا ہے، اس کی ہر چیز ہماری ہے۔

جس طرح میدانِ جنگ چھوٹ جانے کے بعد، جذبۂ جنگ جوئی کی تسکین کے لیے، یہاں مختلف چھوٹے بڑے جانوروں کی لڑائیوں کا تماشا کام آتا تھا، اُسی طرح اِس اہم عنصر، یعنی مذہبیت نے ایک دوسرے انداز سے اس جذبے کی تسکین کا کچھ سامان فراہم کر دیا تھا۔ لکھنؤ میں جو تولّا اور تبرّا کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی، اُس میں دہلی کی روایت کا جذبہ بھی شامل تھا اور اس کے ساتھ ساتھ، اُس جذبے کی تسکین کا کرشمہ بھی شامل تھا، جس سے دشمنوں کو زار و زبوں دیکھ کر یا فرض کر کے، تسکین ملا کرتی ہے۔ میدانِ جنگ میں نہ سہی، دیوان خانے کی مجلس میں سہی۔

مذہبی عناصر نے، جن کے فروغ کے لیے دہلی کی فضائیں تنگ معلوم ہوتی تھیں، اور وہاں ہمیشہ ایک کشمکش کا سا احوال رہا کرتا تھا، اِس نئی مملکت میں، نئے نئے مظاہر،

اور نئی نئی رسموں کی شکل میں فروغ پیدا کیا۔ اور یہ پوری معاشرت پر چھا کر رہ گئے۔ عزاداری، سوز خوانی، امام باڑے، کربلا، حضرت عباس کی درگاہ، مرثیے کی مجلسیں، یہ سب تہذیبی مظاہر کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ایک طرف تو معاشرت میں لذت کوشی کی انتہا تھی، دوسری طرف عزاداری کا عروج تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس سے معاشرے کا حُسن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ان عناصر نے تضاد اور ثنویت، یعنی دُہرے پن کو معاشرت کا نہایت حسین اور لازمی جُز بنا دینے میں بہت کام یابی حاصل کی۔ اور تصنّع کو فروغ بخشا۔

اِن حالات میں اگر شاعری میں ظاہر آرائی، رعایتِ لفظی اور بے روح خیال آفرینی کا اثر بڑھا تو اس میں تعجّب کی کیا بات ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ لفظ و معنی کی ثنویت اور ظاہری رُخ کی برگزیدگی کو اہمیت ملنا ہی چاہیے تھی۔ اور اس لحاظ سے ناسخ کا اسلوب، اپنے عہد کا تقاضا تھا اور ان کی شاعری، اپنے عہد کی سچی ترجمان ہے۔ وہی تکلّف، رکھ رکھاو، رعایتیں، تلازمے، وہی ظاہر آرائی، وہی پُر تصنّع آہنگ و اسلوب، اور وہی بے روح مضامین جو اُس معاشرے میں کھرے سکوں کی حیثیت رکھتے تھے، یہی ان کا سرمایۂ کمال ہے۔

۲

ناسخ کا سالِ ولادت ۱۱۸۵ھ (۷۲-۱۷۷۱ء) بتایا گیا ہے۔ مصحفی نے ۱۲۲۴ھ میں اپنے چھٹے دیوان کے دیباچے میں ناسخ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ناسخ کے نئے طرزِ سخن کی شہرت نصف النّہار پر تھی۔ مصحفی کے بہ قول ناسخ نے ۲۰ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا تھا (ریاض الفصحا) اس حساب سے اُس وقت تک ان کی مشقِ سخن کو تقریباً بیس سال ہو چکے ہوں گے۔ شہرت،

اُستادی اور کسی نئے طرز کی تشکیل کے لیے یہ مدت کافی ہے۔
اِس حساب سے تیرھویں صدی ہجری کا آغاز، ناسخ کی شاعری کا آغاز ہے اور اس کی تیسری دہائی میں وہ مسندِ اُستادی پر بیٹھ چکے تھے۔ اور ان کے نئے طرز کو اس قدر اہمیت حاصل ہو چکی تھی کہ مصحفی جیسے شاعرگر استاد نے ان کے نئے انداز کی تقلید گوارا کی۔ (تقلیدِ مصحفی کے متعلق اس مقالے کے دوسرے حصّے کی آٹھویں فصل میں گفتگو کی گئی ہے۔ اِس بیان کو اُس صراحت کی روشنی میں دیکھا جائے) ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں آصف الدولہ مرحوم ہوئے۔ اسی سال نواب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے۔ ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں اُن کا انتقال ہوا۔ گویا ناسخ کی شاعری کا عروج، عہدِ سعادت علی خاں میں ہوا۔
ناسخ نے جب شاعری کا آغاز کیا ہے، اُس وقت لکھنؤ میں دہلوی شعرا کا طوطی بول رہا تھا۔ سودا اور میر حسن تو مرحوم ہو چکے تھے۔ سودا ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء) میں مرے ہیں۔ میر حسن ۱۲۰۱ھ (۱۷۸۶ء) میں فوت ہوئے۔ یہ زمانہ وہ ہے جب ناسخ نے شاید شاعری کا آغاز کیا ہوگا۔ میر سوز نے ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں رحلت کی۔ یہ زمانہ ناسخ کی ابتدائی شاعری کا ہوگا۔ البتہ جرأت، انشا، مصحفی اور میر موجود تھے۔ جرأت ۱۲۲۴ھ میں اور میر صاحب ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ اس وقت تک ناسخ ناسخ بن چکے تھے۔ ان کو طرزِ قدیم کا منسوخ کرنے والا اور طرزِ جدید کا موجد مان لیا گیا تھا۔ انشا اس کے بعد ۱۲۳۳ھ میں مرے ہیں۔ مصحفی نے سب سے زیادہ زمانہ پایا۔ وہ ۱۲۴۰ھ میں اس دنیا سے اُٹھے۔ (یہ تاریخیں، حواشیِ دستور الفصاحت سے ماخوذ ہیں۔)
اِس حساب سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ناسخ کی شاعری نے جب شعور کی آنکھیں کھولی ہوں گی، تو انشا، مصحفی، جرأت اور میر صاحب کی شاعری کا دور دورہ ہوگا۔ ان

سب شاعروں کا انداز الگ الگ تھا، مشترک بس ایک بات تھی کہ یہ سب دہلی سے ہجرت کر کے آئے تھے اور اعتبار و افتخار کی سند اور شہرت و عزت کی دستاویز ساتھ لے کر آئے تھے۔ جب یہ لوگ لکھنؤ میں وارد ہوئے تھے، اُس وقت ہر چیز کے لیے سند دہلی سے حاصل کی جاتی تھی، حکومت ہو یا ادب سب میں۔ اِن شاعروں میں میر صاحب کی شخصیت اور شاعری سب سے الگ، ممتاز اور منفرد تھی۔ شہرت بھی سب سے زیادہ تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عزت و احترام کے نور کا ہالہ اُن کے گرد روشن تھا۔ میر صاحب کو اپنے غموں سے فراغ تو دہلی میں بھی نہیں ملا تھا، اور یہاں تو زندگی کے آداب و اطوار بھی کچھ بدلے ہوئے تھے، یہ چیزیں اُن کے مزاج سے میل کھانے والی نہیں تھیں لیکن شخصیت اس قدر بلند بالا تھی کہ ہر شخص اُن کا احترام کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے باوجود کہ ان کی شاعری انفرادی طور پر دلوں کو متاثر کرتی تھی، لیکن وہ اس معاشرے کے رنگ و آہنگ سے بالکل مختلف تھی۔ اس لیے اس کی گنجائش بالکل نہیں تھی کہ وہ اُس زمانے کے شعری تصورات کو متاثر کر سکتی۔ معاشرتی تبدیلیوں کی لہریں نہ زیادہ طاقت ور تھیں۔ میر صاحب کا انداز دلوں پر حکومت کر سکتا تھا، لیکن یہاں ضرورت ایک ایسے اسلوب کی تھی جو ذہنوں کو مرعوب کر سکے۔

جرأت کی شاعری، جس کو میر صاحب نے "چوما چاٹی" سے تعبیر کیا تھا اور مصحفی نے اس کو "چھنالے کی شاعری" کا خطاب عطا فرمایا تھا، قبولِ عام کے اجزا سے معمور تھی۔ یہی حال رنگین و انشا کی چلبلی شاعری کا تھا۔ آزاد کے الفاظ میں: "جب رواجِ عام کا راجہ ہولی کھیلتا ہے تو بڑے بڑے معقول اشخاص اس کی چھینٹیں فخر سمجھ کر سر و دستار پر لیتے ہیں۔ پس وہ اور ان کے معاصر ملک چھوڑ کر کہاں نکل جاتے۔ یہیں رہنا تھا اور انھی لوگوں سے لے کر گزران کرنی تھی۔"

جرأت و انشا جس طرح کی باتیں کرتے تھے اور جس زبان میں باتیں کرتے تھے، ان کو حالات کے زیرِ اثر قبولِ عام تو حاصل تھا، لیکن ان میں سے کسی کی شخصیت میں یہ توانائی نہیں تھی اور نہ اس اسلوب میں یہ قوت تھی کہ ناسخ کے اسلوب کا حریف ہو سکتا۔ ساری خوبیوں کے باوجود یہ لوگ ایک طرح سے ماضی کی یادگار تھے، پرانی روایتوں کے نمایندے تھے۔ ان کے اسلوب میں ایک پُرانا پن تھا۔ لذّت تھی، وسعت نہیں تھی۔ جب کہ یہ نیا معاشرہ اپنے آپ کو مجموعی طور پر شاعری میں بھی نمایاں کرنا چاہتا تھا، خارجیت، ابتذال، ظاہر آرائی اور بلند آہنگی کے پورے سروسامان کے ساتھ۔ اس نئے معاشرے کو ایک ایسے پیرایۂ اظہار کی تلاش تھی یا یوں کہ لیجیے کہ ضرورت تھی، جس میں اس قدر وسعت ہو کہ سارے چمک دار عناصر کو جذب کر سکے اور نئے نئے تلازمے جمع کر سکے۔ جرأت و انشا بہت کچھ تھے، لیکن ان کے اسلوب میں ایک طرح کا پرانا پن ضرور تھا۔ باتیں تو دل چسپ کرتے تھے، لیکن باتیں کہنے کا ڈھنگ بہت زیادہ مانوس تھا۔ جب کہ اُس زمانے میں نگاہوں کو ہر سطح پر نئی سے نئی چیز کی تلاش تھی۔ یہ لوگ مقامیت کے شرف سے بھی محروم تھے۔ جب کہ نچلی سطح پر دہلی و لکھنؤ کی رقابت کے احساسات نشو و نما پا رہے تھے ___ یہی وجہ ہے کہ جب ناسخ نے ایک نئی آواز بلند کی، تو ان میں سے کوئی شاعر ان کا حریف نہیں ہو سکا۔ جب کہ ناسخ ان سب کے مقابلے میں نو آمدہ تھے اور یہ لوگ ایک زمانے سے اعتبار و شہرت کی مسندوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن اعتبار اور شہرت کوئی چیز بھی حریفِ نبرد نہ بن سکی۔ ۱۲۲۴ھ کے آغاز تک انشا، جرأت، رنگین، مصحفی، میر صاحب، سبھی زندہ تھے، لیکن شہرت تھی ناسخ کے اسلوب کی، جس کے لیے کہا جاتا تھا کہ اُس نے پرانی سادہ گوئی کو منسوخ کر دیا ہے۔ یہ سب دہلوی شاعر، طرزوں کے اختلاف کے باوجود، بنیادی طور پر "سادہ گو" تھے۔ یہ صفت ان سب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی تھی، اور اس

نئے معاشرے کو سادگی سے گویا بیر تھا۔ مرصع سازی پر اس کا ایمان تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر ان لوگوں کا اسلوب، اس معاشرے کا اپنا اسلوب نہیں بن سکتا تھا۔ اس کی عزّت کی جا سکتی تھی، لُطف بھی لیا جا سکتا تھا، لیکن اسے اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مصحفی بہت پُرانے مشاق اور پُرگو تھے۔ اچھے شاعر تھے، اُستاد تھے، لیکن وہ جرأت و انشا سے خواہ اور باتوں میں بلند ہوں، اسلوب کے معاملے میں بہت پیچھے تھے۔ سادہ گوئی کی بنیادی صفت کے باوصف، جرأت و انشا کا اپنا اپنا خاص انداز بھی ہے جو صاف صاف پہچانا جاتا ہے۔ مصحفی اس سے محروم تھے۔ ان کی سب سے بڑی صفت انتخابیت تھی، یعنی ہر رنگ میں کہہ سکتے تھے۔ وہ ناسخ کے حریف کیا ہوتے۔ جس طرح وہ اوروں کے انداز کی تقلید کرتے تھے، اُسی طرح ناسخ کے انداز میں بھی کہنے لگے۔ شاعر اچھے تھے، استاد کامل تھے، اچھے اچھے شعر بھی کہے ہیں، لیکن انفرادیت سے تہی دامن اور تقلید کے خوگر تھے۔

اس کو یوں بھی دیکھیے کہ ناسخ نے اپنے کلام میں سودا، میر اور درد کا جگہ جگہ اس طرح نام لیا ہے کہ عقیدت کی مہک آتی ہے۔ جب کہ سودا و درد بہت پہلے مر چکے تھے۔ اور میر صاحب کا انداز، ناسخ کے انداز سے مختلف نہیں، متضاد تھا۔ لیکن جرأت، انشا، مصحفی کا ایک جگہ بھی نام نہیں لیا، حالاں کہ یہ لوگ زندہ تھے اور مصروفِ سخن سرائی بھی تھے اور لکھنؤ ہی میں مقیم تھے۔

کہنا یہ ہے کہ ناسخ کے اسلوب کے سامنے کوئی مدِ مقابل نہیں تھا۔ میر صاحب کا انداز اور اُن کی باتیں ضرور ایسی تھیں جو متاثر بھی کرتی تھیں اور مرعوب بھی، لیکن اس دیار میں اب ان کے کلام کی حیثیت میوزیم کے بابرکت و باعظمت مال و متاع کی سی تھی، جس کا احترام کیا جا سکتا ہے، اُس کے محاسن پر وجد کیا جا سکتا ہے، اُس کو

اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

متاخر شعرائے دہلی میں سے مومنؔ اور غالبؔ اپنے اپنے انداز میں یکتا تھے۔ ذوقؔ کو بھی مروۃً شامل کر لیجیے۔ اگرچہ اِن دونوں کے مقابلے میں غزل گوئی کی حد تک اُن کا نام لینا گناہ ہے۔ اِن شاعروں نے ناسخؔ کا زمانہ پایا تھا، لیکن بالکل صحیح معنی میں ان کو ناسخؔ کا ہم عصر کہنا درست نہیں۔ مومنؔ کا سالِ ولادت ۱۲۱۵ھ[1] ہے۔ ذوقؔ ۱۲۰۴ھ[2] میں پیدا ہوئے اور غالبؔ ۱۲۱۲ھ[3] میں عالمِ وجود میں آئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ مومنؔ، ناسخؔ کی ولادت کے کم و بیش تیس[۳۰] سال بعد، غالبؔ تقریباً ستائیس سال بعد، اور ذوقؔ تقریباً اٹھارہ سال بعد پیدا ہوئے۔ یا یوں کہیے کہ ۱۲۲۴ھ میں جب کہ مصحفیؔ نے ناسخؔ کے نئے طرز کی شہرت کا اعتراف کیا ہے، اور یہ زمانہ گویا ناسخؔ کی استادی کا زمانہ تھا، اُس وقت مومنؔ نو دس سال کے ہوں گے، اور غالبؔ کی عمر ۱۲، ۱۳ سال کی ہوگی۔

مومنؔ و غالبؔ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں ایک زمانے میں ناسخؔ کے رنگِ شاعری سے متاثر ہوئے تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہو تب بھی اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ مومنؔ و غالبؔ کی شاعری نے جب شعور کی آنکھیں کھولی ہوں گی تو ناسخؔ کے نئے انداز کا شہرہ پھیل چکا ہوگا۔ یہ شہرت ہو چکی ہوگی کہ ناسخؔ نے پرانی سادہ گوئی کو منسوخ کر کے ایک نیا انداز نکالا ہے۔ اس نئے طرز میں، جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا، کچھ اجزا ایسے ضرور تھے جن میں نظر فریبی کا جادو چھپا ہوا تھا۔ اس لیے ان نوعمر شاعروں کا اس نئے انداز سے متاثر ہونا، نہ غیر قدرتی ہے

---

[1] آبِ حیات۔ [2] ذوقؔ۔ سوانح اور انتقاد ص ۲۴۔ [3] ذکرِ غالبؔ ص ۲۵ (چوتھا اڈیشن)

اور نہ چنداں تعجب کی بات ہے۔ البتہ یہ ان کی انفرادیت کا کارنامہ ہے کہ دونوں نے جلد ہی اپنے آپ کو پالیا۔ اور اپنے منفرد انداز کو آب داری بخشی۔ یہی وہ منزل ہے جہاں حقیقی و غیر حقیقی کا پتا چلتا ہے اور انفرادیت کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے متشاعر یا معمولی شاعر تقلید ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے اور واقعی شاعر اگر کسی لمحے میں کسی رنگ سے متاثر ہوتا بھی ہے، تو اس کا اسیر نہیں ہو پاتا اور جلد ہی اپنے مرکز پر واپس آجاتا ہے۔

ناسخ کی شاعری

ناسخ کا اسلوب، جس کی ایک زمانے میں واقعی دھوم مچ گئی تھی اور جس کے اثرات دنوں تک غزل کی دنیا پر چھائے رہے، اس کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ ضروری ہے۔

ناسخ کے اسلوب میں جو چیز سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ ہے لفظوں کے نئے نئے تلازمے، جن کی مدد سے وہ استعاروں کے نئے نئے پیکر تراشتے ہیں۔ اِس ظاہر فریب انداز کی دل کشی اُس وقت کچھ اور بڑھ جاتی ہے جب وہ شعر میں ایسے مختلف لفظ جمع کرتے ہیں جن میں بہ ظاہر کوئی نسبت نہیں ہوتی، لیکن اُن کی صناعی کی طاقت اُن سب لفظوں کو اِس طرح منسلک کرتی ہے کہ نئی نئی نسبتوں کے رشتے چمک اٹھتے ہیں اور پڑھنے والا، ایک عجیب طرح کی حیرت آمیز مسرت سے اچانک دوچار ہو جاتا ہے۔

اِسی کے ساتھ ساتھ پڑھنے والا ایک خاص طرح کے بلند آہنگ کو بھی محسوس کرتا ہے۔ ایسا آہنگ جس کو آپ پُر وقار کے لفظ سے بھی یاد کر سکتے ہیں۔ دردمندی کی آواز کے مقابلے میں یہ آہنگ زیادہ آسانی کے ساتھ اور زیادہ تعداد میں لوگوں کو متاثر کر سکتا ہے۔ یہ ناسخ کے اسلوب کا دوسرا اہم عنصر ہے۔

آہنگ کی تشکیل دو طرح ہوتی ہے: شاعر کا باطن خروشِ احساس سے معمور ہو، اُس کا ذہن اعلا افکار کا مخزن ہو اور شخصیت میں انفرادیت کی توانائی بھی محفوظ ہو؛ اِس صورت میں وہ پُر وقار اور صداقتِ احساس کی توانائی سے لب ریز آہنگ وجود میں آئے گا جو مثلاً رومی، حافظ، عرفی، فیضی، غالب یا اقبال کے یہاں ملتا ہے ــــــ دوسری صورت یہ ہے کہ جذبہ و احساس کے بجائے سارا کاروبار ذہنی موشگافی کا کرشمہ ہو۔ مشاقی کی فن کارانہ طاقت اور معنی آفرینی کی

دست رس حاصل ہو۔ اس صورت میں سارا زور اس پر صرف ہوگا کہ لفظوں کے تلازموں سے خیال آفرینی کی جائے اور پھر اس کو ایسے لفظوں میں اسیر کیا جائے جن میں صوتی اعتبار سے بھاری پن پایا جاتا ہو۔ ناسخ کے یہاں یہی آہنگ کار فرما ہے۔ مثلاً ان شعروں کو دیکھیے:

مراسینہ ہے مشرق، آفتابِ داغِ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر، چاک ہے میرے گریباں کا
کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے — کہ نورِ صبحِ صادق ہے، غبار اپنے بیاباں کا

ہے گلشنِ قرطاس میں گل بانگِ عنادل — میرے قلم قافیہ پرداز کی آواز

خوب موزوں ہم سے وصفِ قدِ بالا ہوگیا — عالمِ بالا تک اپنا بول بالا ہوگیا

مرتبہ کم، حرصِ رفعت سے ہمارا ہوگیا — آفتاب اونچا ہوا ایسا کہ تارا ہوگیا

سیکڑوں آہیں کروں پر ذکر کیا آواز کا — تیر جو آواز دے، ہے نقص تیر انداز کا

کیا اثر میری سیہ بختی کے آگے نور کا — ماہ ہے اک خالِ رخسارِ شبِ دیجور کا

کوئی غارت گر نہیں دیوانوں کے اسباب کا — خانۂ زنجیر کو کچھ غم نہیں سیلاب کا
رہتی ہے ہر روشنی میرے سیہ خانے سے دور — تن رہا ہے شامیانہ چادرِ مہتاب کا

ان اشعار میں لہجے کی جو بلند آہنگی ہے، یہ ناسخ کے کلام کا عام جوہر ہے۔ اس میں یہ تاثیر

تو نہیں کہ دل سے جگر تک اُتر جائے۔ لیکن چند لمحوں کے لیے ذہن کو متاثر ضرور کر سکتا ہے۔

یہ انداز، جس میں الفاظ کے جماؤ سے بلند آہنگی پیدا کی گئی تھی، ایک نئی آواز کی بشارت تھا۔ اس انداز کی خوبی میں مزید اضافہ اس طرح ہوا کہ جن باتوں کو اب تک اچھے غزل گو شعرا نے مبتذل سمجھا تھا، ان کو من جملۂ مضامینِ غزل قرار دیا گیا۔ ان مبتذل مضامین کو بہ راہِ راست بھی نظم کیا گیا اور استعارے تشبیہ سے سجا کر یا کسی لفظی صنعت سے آمیز کر کے بھی جزوِ شعر بنایا گیا۔ ناسخ کے اسلوب کا یہ بھی ایک اہم عنصر ہے۔

ناسخ اُن لوگوں میں سے تھے جن کے نزدیک پھول کے وجود سے زیادہ، پھول کا لفظ اہمیت رکھتا ہے۔ چاندنی کے تاثرات کیا ہوں گے، یہ ثانوی بات ہے۔ چاندنی کے لفظ سے کون کون سے تلازمے فراہم کیے جا سکتے ہیں اور ان کی مدد سے کتنے استعاروں کی صورت تراشی کی جا سکتی ہے۔ اولین اہمیت اِس کی ہے۔ لفظ پرستی اور صورت شناسی کی یہ صفت جب مزاج پر پوری طرح حاوی ہو جاتی ہے تب معنویت کا پہلو دب جاتا ہے اور صورتوں کا جلوہ چھا جاتا ہے۔ اس مزاج کے زیرِ اثر، ذہن نئے نئے تلازمے تلاش کرنے میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ لفظ کی ثقالت یا مضمون کی رکاکت اس کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اگر کوئی نئی بات پیدا کی جا سکتی ہے تو یہ کافی ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ مضمون کیسا ہی ہو، اُس کو بندش اِس پہلو سے دی جائے کہ خیال کے بعض نئے پہلو چمک اٹھیں۔ اور یہ معلوم ہو کہ شاعر کی نکمّہ نے آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہوگا، تب یہ پہلو خیال میں آیا ہوگا۔ ناسخ کو اِس میں قابلِ رشک دسترس حاصل تھی اور یہ اُن کے انداز کا نہایت نمایاں پہلو ہے۔ مثلاً ان شعروں کو دیکھیے:

خاکِ صحرا چھانتا پھرتا ہوں اِس غربال میں　　　آبلوں میں کر دیے کانٹوں نے روزن زیرِ پا

ساغر میں عکسِ رُخ، رخِ گل گوں پہ ہے عرق　　موتی جو آگ میں ہے، تو شعلہ ہے آب میں

ایک درہم اور داخل گنجِ قاروں میں ہوا　　پست ایسا میرے طالع کا ستارا ہو گیا

دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے　　گماں ہے تختہ، تابوت پر تختِ سلیماں کا

جل نہیں جاتا جو وصفِ روئے آتش ناک سے
طائرِ مضموں بھی گویا اب سمندر ہو گیا

نہیں آتا نظر، مرہم لگائے کس جگہ کوئی　　دہانِ یار گویا منہ ہے میرے زخمِ پنہاں کا

خیال آفرینی کی اِس ورزش کا ایک روشن پہلو تو یہ ہے کہ کبھی تو اس میں دل کشی کا رنگ بے طرح چمک اٹھتا ہے۔ تشبیہ یا استعارے کی مدد سے کوئی ایسا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے جس میں کاوش کی سنگینی پر تعبیراتی انداز کی نگینی غالب آ جاتی ہے۔ جیسے یہ شعر:

آتشِ رنگِ حنا سے، شمع ہیں سب انگلیاں　　دستِ جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا

منہدی سے ہے شعلہ، قدم اُس رشکِ پری کا　　پاپوش نے سیکھا ہے چلن کبکِ دری کا

کس قدر دل چسپ لیکن پُر فریب طرز ہے یہ۔ آج بھی ایک لمحے کے لیے تو سننے والا واہ کہنے پر آمادہ ہو ہی جائے گا۔ اسی قبیل کے کچھ اور شعر دیکھیے۔ ان سب میں وہ بات بھی مشترک ملے گی جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا تھا، یعنی مختلف لفظوں

کے نئے نئے تلازمے اور پھر ان کو اس طرح ترتیب دینا کہ پڑھنے والا تعجب آفریں مسرت کے احساس سے دوچار ہو جائے، لمحہ بھر ہی کے لیے سہی۔

رکھتا ہے فلک سر پہ بنا کر شفق اس کو ۔۔۔ اڑتا ہے اگر رنگِ حنا تیرے قدم سے

نقش ہیں تسخیرِ دل کے واسطے نقشِ قدم ۔۔۔ سایہ تیرا اے پری، جادو کا پُتلا ہو گیا

دشتِ جنوں میں آبلے پھوٹے نہیں مرے ۔۔۔ یہ ہے شبیہِ دیدۂ خوں بار، پانو میں

اُس پری نے جب اٹھایا سنگ مجھ دیوانے پر ۔۔۔ آتشِ رنگِ حنا سے صاف اخگر ہو گیا

لکھتے ہی اُڑتے ہیں اطرافِ جہاں میں اپنے شعر ۔۔۔ طائرِ معنی کو کاغذ شہپرِ پرواز ہے
جلوۂ معشوق کے باعث ہیں عاشق آپ ہی ۔۔۔ آتشِ گل، بلبلوں کا شعلۂ آواز ہے

حُسن کے نالے گھر سے نکلا ہے جو وہ خورشید رو ۔۔۔ یہ تجلّی ہے ہر اِک شعلۂ آواز کی
شعلۂ رخسارِ جاناں نے لگائی ہے جو آگ ۔۔۔ ماہِ تاباں، آج مہتابی ہے آتش باز کی

یا ایک خاص طرح کا مغالطہ آفرینی کا دل چسپ انداز، جیسے:

پھول جھڑتے ہیں ترے مُنہ سے جو اے رنگیں بیاں
نکتہ چیں آیا تری محفل میں، گُل چیں ہو گیا

یہی بات کبھی ایہام کے واسطے پیدا کی جاتی ہے، جس میں صنعتِ حُسنِ تعلیل کا پہلو بھی نمایاں رہتا ہے، مثلاً:

بد عمل جو ہیں، وہ باز آتے نہیں تعذیر سے ۔۔۔ چور کو پروا نہیں گو ہے مثالِ دار، شمع

یا اثباتِ ادّعا کا کوئی دل چسپ پہلو، مثلاً:

آسماں پہنچا نہیں سکتا حسینوں کو ضرر　　کب لگا سکتی ہے بجلی ماہ کے خرمن میں آگ

یہ شاعری بے روح سہی، لیکن معنی آفرینی کے حُسن سے عاری نہیں۔ اس میں جو ظاہر فریب انداز ہے، وہ اُس زمانے میں ایسے نئے پن سے معمور تھا جو اُس نئے معاشرے سے پوری طرح میل کھاتا تھا۔ یہ شاعری وہ ہے جس میں صرف اوپر کی سطح دل چسپ اور تعجب آفریں ہے۔ خاص خاص لفظوں کو جن پہلوؤں سے بٹھایا جاتا ہے اور پھر ذہن ان لفظوں کے تلازموں سے جو خیالی مضامین تراشتا ہے، یہ عمل اور اس کا اظہار، دونوں بہ جائے خود دل چسپ ہوتے ہیں۔ یہی وہ رنگ ہے جس کو تذکرہ نویسوں نے "معنی آفرینی" اور "تلاشِ مضامینِ تازہ" سے موسوم کر کے اس کو ناسخ کا امتیازی وصف قرار دیا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ انداز بہت دور تک ساتھ نہیں دے پاتا۔ چوں کہ غرض صرف لفظوں سے ہے، وہ کیسے ہی ہوں، اگر ان کی مدد سے کوئی نیا رُخ پیدا کیا جا سکتا ہے کسی تلازمے کا، تو یہ کافی ہے، اس لیے ذہن مبتذل اور غیر مبتذل میں فرق کرنا روا نہیں رکھتا۔ یہ اس روشِ خیال آفرینی کا تاریک پہلو ہے۔ چوں کہ استادی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ مشکل سے مشکل زمینوں کو سرسبز کیا جائے اور کڈھب سے کڈھب قافیوں کو نئے نئے رُخ سے جمایا جائے اور پھر ان کی مدد سے نئے نئے نظر فریب کرشمے دکھائے جائیں، اس لیے غیر شاعرانہ عناصر کا اوسط بڑھتا ہی رہتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے اس رنگِ سخن کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے:

تو لگائے گا جو قاتل سرمۂ دنبالہ دار　　تیری شمشیرِ نگہ کو بہ تلا ہو جائے گا

اُس پری کا نیل ملوانا بدن پر ہے بجا　　ہے چراغِ خانۂ حُسن، اس کو روغن چاہیے

نہ ہمارے دلِ بے تاب کو زلفوں نے نکال
پارے سے ہوتی نہیں گیسوؤں میں جوں پیدا

میں لے کے ہاتھ میں پستانِ یار مرتا ہوں
جریدتین کو لاؤ کوئی انار کی شاخ

مرغِ زرّینِ فلک انڈے سے کبھی نکلا نہیں
یہ شبِ فرقت ہے اے ناداں ابھی ہے دور صبح

ایسی ہے کس ساز کی آواز خوش
یار کے دروانے کی کیا چول ہے

پہنی جو چنوا کے چپکن یار نے
جو مرا مضمون ہے، چسپیدہ ہے

آب خجلت سے نہ ہوں کیوں میرے مروارید اشک
جب لگا دے وہ صنم موتی کا چونا پان میں

گڑ گئے ہیں سیکڑوں شیریں ادا شیریں کلام
جا بہ جا ہوں چیونٹیوں کے کیوں نہ روزن خاک میں

چاہِ ذقن میں طائرِ دل یوں اسیر ہیں
ہوں جس طرح کنویں میں کبوتر بھرے ہوئے

وصل کا دن ہو چکا، اُن کا نہیں جانا بجا
اے کبوتر باز، جوڑے کے کبوتر کھول دے

اس رنگ کی کلام ناسخ میں جلوہ گری بہت زیادہ ہے۔ یہی وہ انداز ہے جس نے ناسخ کے بعد آنے والوں کو بھی اور ان کے تلامذہ و مقلدین کو بھی بُری طرح اسیر

بنایا اور رعایتِ لفظی کے اُن عجائبات کے دفتر تیار ہو گئے جن کا پڑھنا بھی آج مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اس بد مذاقی کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ مانوس و نامانوس الفاظ کا امتیاز اٹھ گیا اور جس طرح مبتذل مضامین کثرت کے ساتھ غزل کا جز بنے، اسی طرح ثقیل لفظ بھی بے تکلف نظم کیے گئے۔ اس چیز نے غزل کی زبان کو سخت نقصان پہنچایا۔ جس طرح کہ مبتذل مضامین نے غزل کے مزاج کو بگاڑا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ناسخ کی غزلوں کی زبان اکثر جگہ فصاحتِ کلام کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ ایسے مصرع:

اُن سے اشبہ جو ہمارے دیدۂ بیدار ہیں

جز ہے تیغِ جدائی ہوں، ہاتھ میں باندھوں

نظر آجاؤ کہیں، ہم بھی بصر رکھتے ہیں

چہرہ گیسو سے ستارہ ذوذنابا ہو گیا

جز وصل کیا دوائے متوہم مفید ہو

لیکن ہیں بڑی چھنال آنکھیں

ہوں وہ خوش طالع، مری جانب ہو تقدیم نہنگ

ہوں جو عیسیٰ بھی، ارادہ ہو نہ استعلاج کا

فصاحت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ ایسی ہی بے امتیازیوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ناسخ کی زبان، نفاست اور تراش کے اُس حُسن سے محروم رہی جس کو لکھنوی معاشرے کے دوسرے مظاہر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اُن کی غزل، زبان کی حد تک، معیاری غزل گوئی کے اسلوب سے بے تعلق رہی۔ ہاں انھوں نے اپنا خود ایک معیار بنا لیا۔ قدیم سادہ گوئی کے مقابلے میں یہ واقعتہً نیا معیار تھا۔

ناسخ کی غزلوں میں ایک رنگ اور بھی نمایاں ہے اور وہ ہے خارجیت کا۔ یہ خارجیت

جرأت کی معاملہ بندی سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں سامانِ آرائش، لباس کے اجزا، رنگِ پیراہن، رنگِ پان اور سُرمے مسّی وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ناسخ کے یہاں بھی اور اُن سے زیادہ ان کے تلامذہ و مقلّدین کے یہاں اس کی بہتات نے سخافت کے انبار لگا دیے ہیں۔ اُس نئی معاشرت کی لذّت کیشی میں جس کا نقشِ اوّل شجاع الدولہ کی طوائف پرستی نے درست کیا تھا اور جس میں رنگ آمیزی ہوئی تھی آصف الدولہ کے عہد میں، جب کہ زندگی میں بے پروا خرامی کا حصّہ غالب آگیا تھا اور شیوۂ رندانِ بے پروا خرام کا دور دورہ تھا، اس رنگ کی مقبولیت لازمی تھی اور اس رنگ کا فروغ، وقت کا تقاضا تھا۔ عیش کی ترنگوں نے ایسے خیالات میں امنگ کی چمک بھی پیدا کر دی تھی۔ اس لیے یہ خارجیت، جو اپنی مثال آپ تھی، اعضا کی حرکات شماری اور اجزائے آرائش کے چٹخارے دار بیان پر مشتمل رہی —

ظاہر ہے کہ ایسے بیانات میں توازن کا برقرار رہنا مشکل ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب کہ لفظی رعایتوں کے واسطے سے نئی سے نئی بات کہنے کا شوق ہو، خواہ وہ نئی بات کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ناسخ کی غزلوں میں خاصی تعداد میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں طبیعت نے خوش مذاقی سے بالکل قطعِ تعلق نہیں کیا ہے۔ ان اشعار میں دل کشی نہ سہی، دل چسپی کا ایک رنگ ضرور ہے۔ ایسے کچھ شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہاں صرف سطحی آرائش کا ذکر ہے اور وہ بھی دوٹوک انداز سے۔ بیان کی وہ صنّاعی جس کا رنگ شامل ہو کر اصل رنگ پر میناکاری کا حق ادا کیا کرتا ہے، اُس کی تلاش نہیں کرنا چاہیے۔ وہ شے دگر ہے:

چمکتا ہے سنہرا رنگ ایسا اس پری رو کا — کہ ہے جزوِ بدن سونے کا تعویذ اس کے بازو میں

ہے سنہرا رنگ، اس میں مل گیا سونے کا رنگ — تیرے بازو پر صنم ہیرے کی جوشن چاہیے

مل گیا سونے کے گہنے سے سنہرا جوڑا
رنگ کہتے نہیں، اکسیر اسے کہتے ہیں

واہ کیا رنگ ہے، گویا کہ ٹپکتا ہے شہاب
مُنہ وہ پونچھے تو ابھی سرخ ہو رومال سفید

غور سے ٹیکے کی سرخی کچھ نظر آتی نہیں
رنگِ پیشانی صنم کا مل گیا سیندور سے

لٹک آئی جو بازو پر کوئی لٹ زلفِ پیچاں کی
کیا سونا سگندا اُس نے تری سونے کی جوشن کو

سرخ پوش آئے نظر شوخ، یہ ہے رنگِ بدن
پہنے پوشاک جو وہ سروِ گل اندام سفید

سونا سگندا کیوں نہ کہوں تجھ کو اے پری
رنگت سنہری، اُس پہ یہ خوش بو بدن میں ہے

ہیں گل عذار ماہِ محرم میں سبز پوش
گویا کہ پھول سرخ ہیں اور شاخسار سبز

زباں دانتوں تلے دابی جو اُس نے، یہ نظر آیا
کہ ہے اک پلۂ یاقوت بھی اِس سلکِ گوہر میں

تجھ پر چمن میں عکسِ زرِ گل جو پڑ گیا
جوشِ صفا نے سونے کا زیور بنا دیا

اسی ذیل میں بعض ایسے شعر بھی نکل آتے ہیں جن میں لطافتِ تعبیر کا ایک عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ ایسے شعر واقعی خوب ہیں مثلاً:

نگہ ٹھہرتی نہیں اپنے حسن پر اُس کی
شعاعِ حُسن سے آئینہ آفتاب ہوا

اگر لب سُرخ ہیں تو نشئے سے آنکھیں بھی گل گوں ہیں
بُتوں نے کر دیا ہے ایک رنگ اعجاز و جادو کا

لب ریز اُس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا　　بنتا ہے عکسِ رُخ سے کٹورا گلاب کا

دیکھ کر گل کو، حقارت سے وہ گل کہنے لگا　　بس یہی ہے شاہدِ رنگیں قبائے عندلیب

رنگِ گُل اُڑتے ہی، سوے عارضِ جاناں چلا　　طائرِ نکہت اسیرِ دامِ گیسو ہوگیا

رکھتا ہے فلک سر پہ، بنا کر شفق اُس کو　　اڑتا ہے اگر رنگِ حنا تیرے قدم سے

لیکن مجموعی طور پر اس خارجیت نے کچھ اچھے اثرات نہیں چھوڑے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ناسخ کی اصل توجہ لفظوں کے تلازموں پر مرکوز رہا کرتی تھی۔ لفظ یا مضمون بجائے خود ان کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اصل اہمیت اُن تناسبات کی تھی جو رعایتوں اور صنعتوں کی مدد سے ان الفاظ سے حاصل کیے جا سکتے تھے، اس لیے رکاکت و ابتذال کا آنا ناگزیر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جن لفظوں کو اور جن مضامین کو اعلا درجے کی غزل میں ہمیشہ ناجائز رکھا گیا تھا، یا کم از کم مستحسن نہیں سمجھا گیا تھا، وہ اب اس کا لازمی جُزو بن گئے۔ اِس طرح یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ و مضامین دونوں کے اعتبار سے غزل کا دائرہ وسیع ہوا، لیکن لطافت کا حُسن چھن گیا۔ اس سے پہلے بھی ایسے مضامین غزل میں نظم کیے گئے تھے۔ مگر اُن کی حیثیت ہمیشہ سبزۂ بیگانہ کی سی رہی۔ دوسری بات یہ کہ وہ غزل پر حاوی نہیں ہو سکے تھے۔ ناسخ نے اس راگ کو اس طرح چھیڑا کہ باقی سب آوازیں دب

گئیں اور اب اسی طرح کے مضامین، معیاری غزل گوئی کے حقیقی اجزا قرار پائے۔
ناسخ کا ایک اور کارنامہ، اگر اس کو کارنامہ کہنا مناسب سمجھا جائے، یہ ہے کہ اُس وقت تک غزل میں جو مختلف طرز معیاری حیثیت رکھتے تھے، اور جس میں "سادہ گوئی" کی بہت زیادہ اہمیت تھی، انھوں نے ان سب کو منسوخ کر کے ایک ایسے رنگِ سخن کی بُنیاد ڈالی جس نے چھوٹے سے وقفے میں پُرانے اسالیب کو بے رنگ ٹھہرایا۔ اور محض ایک انداز معیاری انداز قرار پایا۔ لیکن حقیقتہً یہ بُرا شگون تھا۔ غزل سے تنوّع چھن گیا اور اُس ننئی زندگی کی طرح وہ بھی یک رُخی ہو کر رہ گئی۔ ناسخ کے شاگردوں اور مقلدوں نے اس انداز کو آیت و حدیث کا درجہ دے کر اور فروغ بخشا اور کچھ دنوں کے لیے زمین سے آسمان تک اسی بے رنگ یک رنگی کا آوازہ گونجنے لگا۔
دہلی میں اور باتوں کے علاوہ، ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ غزل کے کئی رنگ، کئی انداز اور کئی لہجے تھے۔ یہ فارسی کی کثرت آرائی کے انعکاسات تھے، جو وہاں سیکڑوں برس کی طویل مدت میں صورت پذیر ہوئے تھے اور ارتقا کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد، نفیس ترین سانچوں میں ڈھل کر اُردو میں منتقل ہو گئے تھے۔ تنوّع، رنگارنگی، پہلو داری اور ہزار پہلو معنویت کی روشنیوں کو یہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان اسالیب کی کثرت نے غزل کو واقعی نگار خانہ بنا دیا تھا۔ یہ اس تنوّع ہی کی برکت تھی کہ شاہ نصیؔر جیسے شاعر کی خاراتراشی، وہاں غزل گوئی کے مزاج کو بدل نہیں سکی۔
ناسخ کی خاراشگاف طبیعت نے ان سب کو غیر معیاری بنا دیا اور اس تنوّع کے بجائے غزل کو ایک اور نیا اسلوب عطا کیا۔ حالات نے ان کا پوری طرح ساتھ دیا اور غزل صرف ایک انداز کی اسیر ہو گئی۔ معیاری انداز صرف ایک تھا، جس کو ناسخ کا انداز کہا جاتا تھا، باقی سارے انداز فرسودہ و بے کار تھے۔ حد یہ ہے کہ مصحفی جیسے مشاق استاد کو، اپنے حریفوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اِس

اندازِ ناسخ میں بھی غزلیں کہنا پڑیں ـــــ غزل کو اس سے بہت نقصان پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ مضامین کے اختلاف کے باوجود اِس سلسلے کے اسیر سب شاعروں کی غزلیں ایک سی معلوم ہوتی ہیں۔ جلاؔل کے زمانے تک یہ بے رنگی کار فرما رہی۔ یہ تاریخی حادثہ تھا کہ غزل کا معیاری لب ولہجہ ایک اور صرف ایک خاص لہجہ تھا، ایک خاص انداز تھا۔ اور اس حادثے نے بڑے دور رس اثرات ڈالے۔

لکھنؤ میں جس نئی معاشرت کا خاکا بن رہا تھا وہ یک رُخی یا یک فنی معاشرت تھی، اِس لحاظ سے کہ اُس میں لذت کوشی کی اُمنگ تو تھی، ایسے طاقت ور عناصر کی نمود کم تاب تھی جن کے سنگین وجود کی توانائی سے معاشرت میں توازن برقرار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیش طلبی میں مجہولیت کا رنگ غالب تھا۔ ایسے حالات میں گنجایش اِسی کی تھی کہ جو نیا اسلوب بنے، وہ پُرانے اسالیب سے متائژ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا بھی ہو جس میں معاشرت کے سارے ظاہر فریب چمک دار اجزا کا عکس سما جائے۔ یہ بات ناسخ کے اسلوب میں پوری طرح پائی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ناسخ نے ایک نئے معاشرے کے لیے شعری سطح پر ایک نہایت مناسب پیرایۂ اظہار فراہم کیا۔ اِس اسلوب میں وہ سب خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں جو اُس معاشرے میں کار فرما تھیں۔

انفرادی طور پر یہ ضرور ہو سکتا تھا کہ کسی شخص کے اندر عطیۂ فطرت کے طور پر ایسی توانائی محفوظ ہو جو اس طوفانِ رامش و رنگ اور اس ہنگامۂ ظاہر آرائی میں بھی پابندِ رسم و رہِ عام نہ رہے۔ یا کم از کم یہ تو ہو کہ جب کبھی آنکھ کھل جائے، تو فن کار کی سچی آواز اپنے آپ کو اچانک نمایاں کر لے۔ آتشؔ کی شاعری میں یہی بات پائی جاتی ہے۔

۲

ناسخ کی شاعری میں خیال بند شعرا کے کلام کی اچٹتی ہوئی سی جھلک بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔ لیکن اصلاً ناسخ کا کلام، خیال بند شعرا کے کلام سے مختلف ہے۔ فارسی میں خیال بند شاعروں کا اچھا خاصا گروہ ہے۔ مغل حکومت کے آخری زمانے میں ان کے اثرات بڑھ گئے تھے۔ بیدل اسی گروہ کے نامور شاعر ہیں۔ [اُردو میں غالب کے یہاں بھی اس کے انعکاسات دکھائی دے جاتے ہیں۔]
یہ لوگ بھی خیالوں کی دُنیا میں لفظوں کے تلازمے تلاش کرتے رہتے تھے لیکن خاص بات یہ ہے کہ یہ شاعر گردوپیش کے اسیر نہیں معلوم ہوتے۔ ان کے اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی دنیا بالکل الگ ہے۔ کہیں اور بسی ہوئی ہے، جہاں پرچھائیوں کی کثرت ہے اور یہ اس میں گھومتے رہتے ہیں۔ کوئی بات سوجھ گئی، کوئی نسبت نظر پڑ گئی، یا کسی لفظ نے کسی نئے مفروضے کا رُخ اُبھار دیا، اُس کو ذہن میں بسا لیا اور شعر میں محفوظ کر دیا۔ اُن کے اندر صوفیوں جیسی بے نیازی اور قلندروں جیسی بے پروا خرامی کارفرما نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کو معاشرت کے محرکات سے نہیں، خیالوں کے سایوں سے آب و رنگ ملتا ہے۔ یہ منتشر بلکہ ریزہ ریزہ افکار کے شیدائی ہیں۔ انھی کے متلاشی ہیں۔ مصوری کی زبان میں ان کو تجریدیت پسند کہہ لیجیے۔ ان کی دُنیا عالمِ انعکاسات ہے، جہاں تسلسل مفقود ہے ـــــ ناسخ کی سطح بہت نیچی ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے اسیر ہیں۔ ان کے مفروضات کتابی ہیں یا معاشرتی۔ وہ ان صفات سے معرا نظر آتے ہیں جو خیال بند شعرا کا سرمایۂ امتیاز ہیں۔
ایک بات یہ بھی ہے کہ ان خیال بند شعرا کے یہاں الفاظ کا خلّاقانہ استعمال ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابہام کے پردے میں معنوی وسعت جلوہ گر ہوتی ہے۔ مزاج کی بے نیازی

اور خیالات کے دُھندلے یا نیم روشن عکسوں کی شکل ان کے لفظوں کے واسطے سے شعر میں پوری توانائی کے ساتھ متشکل ہو جاتی ہے۔ الفاظ کے خلاقانہ استعمال سے میری مُراد یہ ہے کہ لفظ ان کے یہاں محض تلازمے کا مرکز نہیں ہوتے۔ ان کے پیچھے غیر مربوط لیکن توانائیِ احساس سے بھرپور افکار کی دُنیا آباد ہوتی ہے۔ تلازمے، ان افکار کے سلسلوں کو ساتھ لے کر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان خیال بند شعرا کے اچھے اشعار پڑھ کر، واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ عکس، جن کو الفاظ کی خیالی نسبتیں نمایاں کر رہی ہیں، ذہن کو کسی اور فضا کی طرف لے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے گرد و پیش کے مظاہر سے رابطہ ٹوٹ سا جاتا ہے ——— ناسخ کے یہاں لفظ، بے جان علامتیں ہیں۔ وہ سطحی تلازموں کے سوا اور کچھ اپنے ساتھ نہیں لاتے۔ ناسخ کی نظر لفظوں کی اوپری سطح کی اسیر ہے۔ وہ اس سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتے۔

ایک بات اور بھی ذہن میں رہنا چاہیے۔ دہلی میں آخری زمانے میں دراصل انتشار کی حکومت تھی۔ ہر چیز بکھر رہی تھی۔ شان دار ماضی رکھنے والی مغل حکومت کا شیرازہ ٹوٹ چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز اپنی عظمت کھو رہی ہے۔ ایسے حالات میں خیال بندی کا فروغ جائے تعجب نہیں۔ خیال بندوں کے مزاج اور فکر و نظر کے لیے یہ ماحول بہت ہی سازگار تھا۔ جس طرح وہ سوچتے تھے، اسی انداز کی ریزہ کاری ماحول میں بھی نظر آتی تھی۔ یہ فضا، خیال بندی اور تصوّف دونوں کو راس آتی ہے۔ یہاں تصوّف کے بجائے خیال بندی کو فروغ ہوا۔ لکھنؤ میں اس کے برعکس ایک نئی حکومت اور ایک نئی معاشرت فروغ پذیر تھی۔ چیزیں قرینے سے تراشی جا رہی تھیں اور سلیقے سے ترتیب پا رہی تھیں۔ امنگ تھی، جوش تھا، ولولہ تھا۔ ایسے حالات میں خیال بندی کا وہ انداز کیسے پنپتا۔

اس کی جگہ معنی آفرینی اور مضمون تراشی نے لی جن پر تکلف کی میناکاری ہو سکتی تھی اور تصنع کا پانی چڑھ سکتا تھا۔

۳

ناسخ نے اگرچہ عربی فارسی کے مغلق سے مغلق لفظ نظم کرنے میں تکلف نہیں کیا، لیکن ان کے یہاں فارسی کی پُر معنی ترکیبوں کی بہت کمی ہے، بلکہ قحط ہے۔ ترکیبیں ہیں لیکن اُس معنوی وسعت سے محروم ہیں جس طرح کی معنوی وسعت مثلاً خیال بند شعرا کی ترکیبوں میں پائی جاتی ہے اور جن کے وجود سے اُردو کی غزلیہ شاعری کو نئی نئی وسعتیں ملی ہیں۔ یہ وہی فکر و نظر کی سطحیت ہے، جس کی وجہ سے لفظوں میں احساس کی حرارت اور جذبے کی گرمی منتقل نہیں ہو پاتی۔ ان لفظوں کی مدد سے جو استعارے تراشے جائیں گے، وہ بھی بے جان ہوں گے اور جو ترکیبیں بنائی جائیں گی وہ بھی بے روح ہوں گی۔
اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ دہلوی شعرا کے سامنے نظیری و عرفی وغیرہ کا کلام مثال و معیار کی حیثیت رکھتا تھا۔ فارسی کے دورِ آخر کے شعرا کے یہاں، جن میں بیدل کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، ایسے مرکبات کی اچھی خاصی تعداد ہے جو دو سے زیادہ لفظوں سے مل کر بنتے ہیں جیسے: آغوشِ مینا خانۂ حیرت۔ ایسے مرکبات میں ایک طرف تو باطنی وسعت زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی وہ معنویت کے کئی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان سے اسلوب میں ایسا نیا پن پیدا ہو جاتا ہے جس میں شعری وقار کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ بہت سے پیچیدہ خیالات کے اظہار کے لیے ایسے مرکبات بہت سازگار ہوتے ہیں کیوں کہ ان کا پیمانہ

کئی مختلف زاویے رکھنے والے لفظوں سے مل کر کچھ اس طرح بنتا ہے کہ اس میں پہلو دار خیالات کے مختلف انعکاسات کو جذب کرنے، اور پھر اُن کو زیادہ جامعیت کے ساتھ دُہرانے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ خیال بند شعرا کے لیے ایسی ترکیبوں کی خاص اہمیت ہے۔

ناسخ اور ان کے تلامذہ کے یہاں یہ پہلو بہت کم زور ہے۔ معمولی ترکیبیں ہیں اور چوں کہ خیالات ان سے بھی زیادہ معمولی ہیں اس لیے ان ترکیبوں میں نُدرت کا وہ عالم پیدا نہیں ہوتا جو دورِ آخر کی غزل کی زبان کی ایک اہم خصوصیت ہے اور جس نے غزل کی زبان کو وقار بھی بخشا ہے۔

مرکبات سادہ ہوں یا غیر سادہ، یعنی وہ دو لفظوں سے مل کر بنے ہوں یا زیادہ الفاظ سے اُن کی تشکیل ہوئی ہو، ایک بات ان میں مشترک ہوتی ہے اور اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ غزل کی حد تک یہ مرکبات، اظہار کی سطح پر نفسِ خیال کے ابتذال کو بڑی حد تک چھپا لیا کرتے ہیں۔ مفرد لفظوں میں محدود معنوی تعیّن ہوتا ہے۔ مرکّبات میں تعیّن کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، یعنی معنوی تعیّن کی سطح اس قدر واضح نہیں ہوتی۔ بات وہی رہتی ہے، لیکن اس کا رُخ ذرا سا بدل جاتا ہے یا دب جاتا ہے۔ جب کہ مفرد الفاظ ابتذال کو بہ مشکل چھپا پاتے ہیں۔ مثلاً ناسخ کے شاگرد خواجہ وزیر کے اس شعر کو دیکھیے:

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

اس میں قتلِ عاشقاں اور یوسفِ بے کارواں نے ایک بات پیدا کر دی ہے، ورنہ خیال نہایت معمولی بلکہ مبتذل ہے۔ ناسخ کے ان دو شعروں کو دیکھیے:

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا　　طلوعِ صبحِ محشر، چاک ہے میرے گریباں کا

کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خیالات نہایت درجہ معمولی بلکہ مصنوعی ہیں۔ اگر ان شعروں میں سیمیا کی سی نمود پیدا ہوگئی ہے تو اس میں مرکبات کے کرشمے کا حصہ زیادہ ہے۔ آہنگ کی تشکیل میں بھی مرکبات کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ ناسخ کے کلام میں اس انداز کے مرکبات نہ ہونے کے برابر ہیں جن سے غزل کی معنوی وسعت میں اضافہ ہوتا ہے۔ فارسی شعرا کی بات جانے دیجیے، مومن و غالب کے انداز کی ترکیبیں بھی ان کے یہاں ناپید ہیں اور سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ وہ گداز اور وہ پرواز نہیں جس کے فیض سے لفظوں میں جان پڑتی ہے اور مرکبات کی ہمہ رنگی جگمگاتی ہے جو ترکیبیں ہیں، وہ معنوی وسعت سے مبرا ہیں۔ میر و درد یا پھر داغ جیسے شاعروں کو ترکیبوں کی اس قدر ضرورت نہیں ہوتی۔ جس قدر مومن و غالب جیسے شاعروں کو ضرورت ہوتی ہے۔ اچھی ترکیبیں، دراصل زندہ استعارے ہوتے ہیں، طاقت سے بھرپور اور وسعت سے معمور۔ ان کی تشکیل کے لیے بھی ایسے ہی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔

۴

ناسخ کے کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس پر سادگی کی پرچھائیں پڑ گئی ہے۔ یہ واضح طور سے ان کے خاص رنگ سے الگ ہے۔ اس کو ایک طاقت ور روایت کی برکت کہا جائے یا طرزِ قدیم کی سخت جانی کہ ان کے کلیات میں متعدد جگہ دہلی کے تین اہم شعرا، میر، درد اور سودا کا ذکر اس طرح آتا ہے جس سے

عقیدت کی مہک آتی ہے۔ درد ہوں یا میر، ان دونوں کی شاعری، ناسخ کی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ مزاج، لب و لہجہ، اندازِ فکر اور طرزِ اظہار، ہر چیز مختلف بلکہ متضاد ہے۔ لیکن ناسخ نے نہایت عقیدت کے ساتھ ان دونوں کا نام لیا ہے اور ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ سودا کے تتبع کا دعوا اگر ناسخ کرتے تو کچھ ایسی تعجب کی بات نہ ہوتی، کئی عنصر دونوں میں مشترک ہیں۔ لیکن میر و درد کی شاعری تو بالکل دوسری دنیا کی شاعری ہے ـــــ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ انشا، جرأت، رنگین، مصحفی، ان شعرا کا وہ نام بھی نہیں لیتے، حالاں کہ یہ لوگ کسی نہ کسی لحاظ سے اُن سے قریب تھے۔ سودا و میر تو خیر لکھنؤ بھی آئے تھے، درد نے تو اس دیارِ مشرق کی سیاحت بھی نہیں کی تھی۔

مزید یہ کہ ناسخ نے سودا کے مقابلے میں میر و درد کا ذکر زیادہ مقطعوں میں کیا ہے اور ان کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی ہیں۔ حالاں کہ ناسخ اور یہ لوگ، دو مختلف دنیاؤں کے باشندے تھے۔ سودا کے لیے تو ایک آدھ جگہ کچھ حریفانہ انداز کا لہجہ بھی استعمال کر لیا ہے، لیکن درد و میر کا ذکر ہر جگہ احترام سے کیا گیا ہے۔ میر و درد کی زمینوں میں جو غزلیں کہی ہیں، ان میں واضح طور پر ناسخ کا لب و لہجہ، اُس لب و لہجے سے مختلف ہے جو اُن کی پہچان ہے۔ یہاں سادگی کا عمل دخل زیادہ ہے۔ یہ سادگی بھی ساختگی کا کرشمہ ہے۔ اس میں کوشش کو دخل ہے، لیکن ہے بہر حال سادگی یا اس سے ملتی جلتی ایک چیز۔ ناسخ کے یہاں جو کچھ سادہ اشعار ملتے ہیں اور جن کو اکثر لکھنے والوں نے ان کے ایک خاص رنگ کے لحاظ سے پیش کیا ہے، ان کی زیادہ تعداد ایسی غزلوں سے حاصل ہوتی ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ان شعرائے دہلی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔

میر کے متعلق تو گفتہ ہائے ناسخ بہت مشہور ہیں ، میں یہاں اُن کے چند ایسے مقطع درج کرتا ہوں جن میں درد کا ذکر آگیا ہے ۔ اندازِ بیان سے عقیدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

کہا حضرتِ درد نے خوب ناسخ ۔۔۔ یہ زلفِ بتاں کا گرفتار میں ہوں

تصور جو ہے درد کی طرح ناسخ ۔۔۔ جدھر دیکھتا ہوں ، وہی روبرو ہے

مے کشی کے باب میں ناسخ جنابِ درد سے ۔۔۔ سُن لے مصرع ، جب تلک بس چل سکے ، ساغر چلے

حاضر ہے قتل ہونے کو ناسخ بھی مثلِ درد ۔۔۔ گر نامِ عاشقی ترے نزدیک ننگ ہے

ناسخ ، قول ہے بجا حضرتِ میر درد کا ۔۔۔ حُسن بلائے چشم ہے ، نغمہ وبالِ گوش ہے

یہی نہیں ، حافظ کا بھی نام لیتے ہیں :

مست ناسخ مجھے رکھتا ہے کلامِ حافظ ۔۔۔ میرے ساغر میں بہ جز بادۂ شیراز نہیں

ان کا یہ کہنا تو نری شاعری ہے کہ بہ جز بادۂ شیراز میرے ساغر میں اور کچھ نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اُن کے ضخیم کلیات میں سے ایسے شعر بھی برآمد کیے جا سکتے ہیں جن میں ان کی اپنی خصوصیات مفقود ہیں اور ان کے بجائے سادہ بیانی کا عکس پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ کہیں کہیں پُرکاری کا انداز بھی آگیا ہے ۔ یہ درحقیقت مذکورہ شعرائے دہلی کے تتبع کا فیض ہے ۔

ناسخ نے جب شعور کی آنکھیں کھولی ہوں گی اور پھر جب شاعری کا آغاز کیا ہوگا

اُس زمانے میں لکھنؤ میں ادبی سطح پر شعرائے دہلی سب کچھ تھے ۔ سودا اور درد یہ دونوں بارھویں صدی ہجری کے آخر تک مرحوم ہو چکے تھے ۔ میر صاحب کا انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا ہے ۔ ناسخ نے میر کا زمانہ پایا تھا اور ان کی خدائی کا دور دیکھا تھا ۔ ایک روایت کے مطابق ان کے پاس اصلاح لینے بھی گئے تھے ۔ ناسخ کے طرزِ نو کا شہرہ ۱۲۲۴ھ میں عروج پر تھا ۔ یہی جرأت کا سالِ وفات بھی ہے ۔ ناسخ نے اپنے نئے اسلوب کے سامنے بیش تر دہلوی شعرا کا اسلوب کم زور یا کم تر پایا ہوگا ۔ دہلوی شعرا سے میری مراد رنگین ، جرأت ، انشا اور مصحفی سے ہے لیکن میر و درد کی شاعری ان کو بھی آسمانی آواز معلوم ہوتی ہوگی ۔ یہ ایسے شاعر تھے جن کی تقلید گویا " مقدورِ بشر سے باہر تھی " یہ شاعری پتھر پر بھی اثر کرتی تھی ۔ اس کے سامنے سر جھکانا ناگزیر تھا ۔ اور مرزا سودا اپنی ہمہ رنگی اور " پُر جوش گفتگو " کے لحاظ سے ناسخ کو مثالی شاعر نظر آئے ہوں گے جن کی تقلید باعثِ تحسین ہو سکتی تھی اس سے کچھ حاصل ہو سکتا تھا ۔ یہ اس پایے کا بلکہ اس انداز کا کلام تھا جس کی تقلید کی جا سکتی تھی ۔ معنی آفرینی اور زورِ بیان کے عناصر سے ذہنی موانست کی خوشبو بھی آئی ہوگی ۔

اُردو غزل کی وہ روایت جو ایک مدت سے اپنا اثر ڈال رہی تھی ، جو زبان کے ریشے ریشے میں بس گئی تھی اور جس روایت کے زیرِ سایہ ناسخ نے آنکھ کھولی تھی ، اس کا کچھ اثر تو نمایاں ہونا ہی تھا ، اُچٹتا ہوا سہی ۔ یہ اسی کی برکت تھی کہ اُن جیسے شاعر کے یہاں بھی کہیں کہیں جذبہ و احساس کی چنگاریوں کا دھوکا ہوتا ہے ۔ برگزیدہ شعرائے دہلی کی شعوری تقلید نے سادہ گوئی کے عکس بھی چمکا دیے ہیں ۔ ناسخ کے کلیات میں اچھا خاصا حصہ ایسے کلام کا ہے جس میں یہ تقلیدی اثرات صاف نظر آتے ہیں ۔ ان کے یہاں اگر کچھ سادہ و صاف شعر مل جاتے ہیں

یا کہیں ناسخی رنگ کے بجائے کوئی اور رنگ چمک گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے کبھی کبھی میر، درد اور سودا کے انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے۔ کوشش میں ذرا بھی خلوص ہو تو ایسا کم ہوتا ہے کہ وہ بالکل رائیگاں چلی جائے۔ اس سے آپ ناسخ کی عقیدت سے زیادہ میر، درد اور سودا کے ہمہ گیر اثرات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہ کہنا بھی شاید بے جا نہ ہوگا کہ عہدِ ناسخ کے کچھ دنوں بعد، لکھنؤ میں ایک بار پھر دہلوی انداز کی تقلید کا دور آیا تھا اور اس سے سب واقف ہیں۔ زندہ اور طاقت ور اثرات کی پہچان بھی یہی ہوتی ہے۔

ذیل میں ناسخ کے کچھ سادہ وصاف اشعار درج کیے جاتے ہیں، اِن سے اُن کے اِس مُستثنا رنگِ سخن کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور اس کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان آوازوں کا پس منظر کیا ہے۔

کس کی ہم جستجو کو نکلے تھے　　　نہیں پاتے کہیں سُراغ اپنا

بے خودی میں یہ کون یاد آیا　　　خود بہ خود دل ہے بے قرار اپنا
آپ میں آئیں، جائیں یار کے پاس　　　کب سے ہے ہم کو انتظار اپنا

[دوسرا مصرع کیسا وسیع المعنی ہے، لیکن پہلے مصرع نے اس کو بے طرح محدود کر دیا۔ نقل اور اصل میں یہی فرق ہوتا ہے۔]

تلاش جس کی ہے دن رات تجھ کو اے غافل
وہ چھپا ہوا ہے تیرے ہی تن کے پردے میں

دگرگوں ہے ہر آن وضعِ محبت
کبھی غیر میں ہوں، کبھی یار میں ہوں

کہا حضرتِ درد نے خوب ناسخ
یہ زلفِ بتاں کا گرفتار میں ہوں

میر درد کا فیض صاف نمایاں ہے]

عشق تو مدت سے اے ناسخ نہیں
مجھ کو اپنی بات کا اب پاس ہے

کب سے ناسخ کی جستجو تھی مجھے
آج وہ خانماں خراب ملا

میں خوب سمجھتا ہوں، مگر دل سے ہوں ناچار
اے ناصحو! بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھ کو

عاشق ہے، پر ابھی نہیں فرقت ہوئی نصیب
ہے اضطراب کی تجھے ناسخ خبر کہاں

دھوم عالم میں مچی ہے تری بد نامی کی
ہائے ناسخ تجھے کچھ عار نہیں، ننگ نہیں

ہر گلی میں ہیں سائلِ دیدار
آنکھ یاں کاسۂ گدائی ہے

میر صاحب کی آواز پر آواز دی گئی ہے۔ کچھ اور شعر دیکھیے ان میں کہیں کہیں سودا کا انداز بھی بولتا ہوا ملے گا۔ پہلے ایک غزل کا مقطع سنیے:

پہلے اپنے عہد سے افسوس سودا اٹھ گیا
کس سے مانگیں جاکے ناسخ اس غزل کی داد ہم

یہ شعر اسی غزل کے ہیں:

کیا اسیری میں کریں شکوہ ترا صیاد ہم
واں بھی کچھ دامِ رگِ گل سے نہ تھے آزاد ہم

یہ زمیں ہے بے وفا، یہ آسماں بے مہر ہے
جی میں ہے اک اب نیا عالم کریں ایجاد ہم

قیدِ ہستی تک ہیں تیرے دامِ گیسو میں اسیر　　تن سے سر آزاد ہو جائے تو ہوں آزاد ہم

کچھ متفرق اشعار۔ پہلے دونوں شعر جن غزلوں کے ہیں وہ سودا کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ مقطعوں میں سودا کا نام لیا گیا ہے۔

ہم صفیر! اس باغ کی کیسی ہوا ناساز ہے　　طائرِ رنگِ چمن تک مائلِ پرواز ہے

جھک جھک کے شیشے ملتے ہیں ہنس ہنس کے جامِ مے

یہ مے کدہ مقام نہیں ہے غرور کا

فصلِ گل میں سیرِ گلشن کو نہ جایا چاہیے　　ان دنوں ناسخ دماغِ باغباں ملتا نہیں

یوں ہو کے سبک دوش جو ملنے کو ہو تیار　　کچھ تو کہو ناسخ کہ ارادہ ہے کہاں کا

جو میں افلاس میں نکلا سفر کو　　برائے راہ زن کچھ لے لیا قرض

دیر ویراں ہے ترے عہد میں، کعبہ ہے خراب　　جمع ہیں کافر و دیں دار ترے کوچے میں

ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں　　جی نہ آبادی میں لگتا ہے، نہ ویرانے میں

عشق میں دل نے پھنسایا تو ہوا غیر کو رنج　　نہیں اپنے میں مروت، جو ہے بیگانے میں

سر بہ کف پھرتا ہوں میں، لیکن کوئی قاتل نہیں　　گردنِ خم گشتہ شاید تیغ کے قابل نہیں

زندگانی خلق کو ہے تیغِ قاتل سے محال　　کشتہ، حسرت ہے، جو تلوار سے بسمل نہیں

معشوق سے امیدِ وفا رکھتے ہو ناسخ
ناداں کوئی دنیا میں نہیں تم سے زیادہ
سو رمز کی کرتا ہے اشارے میں وہ باتیں
ہے لطف خموشی میں تکلم سے زیادہ

کیوں فکرِ عمارت ہے دنیا میں تجھے ناسخ
ویرانے میں گھر کوئی تعمیر نہیں کرتا

کیوں سبک کرتا ہے واں لے جا کے اے بے چین دل
میرا ہونا، اس کی ساری انجمن پر بار ہے

کروں کیا احتیاطِ عمرِ خاکی
غبارِ توسنِ عمرِ رواں ہے

وقت قبول، رشک کے صدمے نہیں قبول
کیا آئیں ہم، رقیب تری انجمن میں ہے

آتا ہے رحم کافر و مومن کے حال پر
بُت محوِ ناز ہے، تو خدا بے نیاز ہے

کیا ہے میں نے اس انداز سے گریباں چاک
کہ سینہ دشمنِ بے درد کا فگار ہوا

رونے روتے اشک آنکھوں میں نہیں
ایسی برسی، ہو گئی خالی گھٹا

سر جھکاتا ہی نہیں ناسخ خدا کے سامنے
ہے یہی اس کی سزا، سجدہ کرے اصنام کو

وہی عاشق ہے جو عالم کو مرقع سمجھے
ہر طرف پیشِ نظر یار کی تصویر رہے

میں نہ فریادی بتوں کا ہوں خدا کے سامنے — آشنا کا کیا گلہ نا آشنا کے سامنے

ان اشعار میں جذبے یا احساس کا کوئی پُر طاقت عنصر پنہاں نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان اشعار میں کچھ توانائی ہے۔ ہلکی سی کشش ہے۔ طرزِ ادا میں سادگی بھی ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے بعض لمحوں میں اپنے آپ کو بھول کر، اپنے انداز کو نظر انداز کر کے، اور دوسروں سے متاثر ہو کر کچھ کہہ دیا ہے۔ ساری خوبیوں کے باوجود یہ تقلیدی رنگ ہے۔ یہ شعر کسی بھی شاعر سے منسوب کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی بھی اوسط درجے کا شاعر ان کا خالق ہو سکتا ہے جب کہ ناسخ اپنے مخصوص رنگ میں اوّل درجے کے شاعر تھے۔

یہ بات کہ ناسخ نے کئی اساتذہ (اور اس سے اساتذۂ دہلی مراد ہیں) سے فیض یاب ہونے کی کوشش کی ہے، ناسخ نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

کون سی طرزِ سخن ہے جو اسے آتی نہیں — کیوں نہ ہو، شاگرد ہے ناسخ ہر اک استاد کا

اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

میں ہی اے ناسخ نہیں کچھ طالبِ دیوانِ میر
کون ہے جس کو کلامِ میر کی حاجت نہیں

ناسخ ! ہے میرِ سلمہ اللہ کی زمین — اک معنیِ شگفتہ کو باندھا ہزار رنگ

پہلے اپنے عہد سے افسوس سودا اٹھ گیا — کس سے مانگیں جاکے ناسخ اس غزل کی داد ہم

تو اس سے مطلب بھی یہی ہوتا ہے۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (مرتبۂ مشفق خواجہ) میں سودا کے ترجمے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ناسخ، سودا کے اس شعر کو پڑھتے تھے اور وجد کرتے تھے:

جس کو پکارتا ہوں، سو کہتا ہے مر کہیں　　ہوتی ہے صبح اور نہ آتی ہے مجھ کو نیند

اسی طرح میر حسن کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "اور اس مطلع کو شیخ ناسخ بھی اکثر پڑھتے تھے اور وجد کرتے تھے"۔ مطلع یہ ہے:

گھر میں ہم رہتے ہیں اور ڈھونڈتے ہیں گھر اپنا　　دھیان رہتا ہے جو اس کوچے میں اکثر اپنا

یہ امور بھی اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان اساتذۂ دہلی کی ان کے نزدیک کیا اہمیت تھی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ ایسے اشعار پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے بعض لمحوں میں اپنے آپ کو بھول کر کچھ کہہ دیا ہے، اس سے میرا مفہوم یہ ہے کہ ایسے اشعار، جستہ جستہ ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ کسی انداز، رنگ یا طرز کی نمائندگی ہوتی ہو۔ تقلید میں یہی ہوتا ہے کہ ایک شعر ذرا زیادہ اچھا نکل گیا، ایک کچھ کم اور ایک بے رنگ۔ میں ایک مثال سے اپنے مفہوم کو واضح کرنا چاہوں گا۔ ناسخ کا ایک مطلع ہے:

ہائے میں کیا کروں، کہاں جاؤں　　وہ نہیں۔ بھولتا جہاں جاؤں

رنگِ دہلی کی نمود عیاں ہے۔ اس مطلع کو کئی لوگوں نے جذباتی اشعار کے ذیل میں نقل بھی کیا ہے۔ اس غزل میں گیارہ شعر ہیں۔ شروع کے پانچ شعر (مطلع کے علاوہ) یہ ہیں:

یہ نہیں چاند، ہے وہی محبوب　　کس طرح تا بہ آسماں جاؤں

آئی یاد اس کی زلف کی زنجیر　　توڑ کر اب تو بیڑیاں جاؤں

دور وہ، میں ہوں مرنے کے نزدیک　　ہائے کیوں کر میں ناتواں جاؤں

رہ نمائی کرے جو عالمِ غیب　　وہ جہاں ہے نہاں وہاں جاؤں

کتنے روزوں سے غم نہیں کھایا　　اس کے گھر آج میہماں جاؤں

ان شعروں میں بے کیفی کے سوا کچھ نہیں۔ مطلع میں ایک چنگاری سی چمک گئی، بس۔

بات یہ ہے کہ اپنے رنگ سے ہٹ کر جب کچھ کہا جائے گا تو یہی ہوگا کہ کہیں کہیں کچھ چمک آجائے۔ وہ رنگ یا انداز میں تبدیل نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ جہاں کہیں چمک آجائے گی، اُس کے علاوہ باقی مقامات بے رنگی اپنا رنگ جمائے گی۔ یہی صورت اِن سادہ و بے رنگ اشعار کی ہے۔ یہی نہیں، جب وہ تلازموں اور تشبیہوں استعاروں کو اپنے انداز کے برخلاف سادگی کا خلعت پنھانا چاہتے ہیں، تو وہاں بھی بے رنگی بلکہ بدرنگی اپنا کمال دکھاتی ہے۔ مثلاً:

چاند پر یہ خاک ہے یا اس کے چہرے پر بھبھوت
بدلی میں سورج ہے یا محبوب کمل پوش ہے

ناک رگڑے ہر پری کیوں کر نہ اس کے سامنے
بدلے نتھنی کے، سلیماں کی ہے خاتم ناک میں

ناسخ نے ایک مقطع میں اپنے اندازِ شعر تراشی کی بہت اچھی تشریح کی ہے:

جی لڑا دیتا ہے، کیسی ہو زمینِ سنگلاخ
خامہ تیشہ ہے، تو ناسخ کوہ کن سے کم نہیں

ان کا قلم واقعۃً تیشہ تھا اور انھوں نے صحیح معنی میں کوہ کنی کی ہے اور یہی ان کا رنگ ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ سرمایۂ کمال کا حقیقی حصہ نہیں۔

۵

ناسخ کے پہلے دیوان میں، آخری دو دیوانوں کے مقابلے میں زیادہ یک رنگی ہے۔ اس میں جو کلام ہے، اس میں ناسخ کا حقیقی کمال معراج پر نظر آتا ہے۔ دوسرے دیوان میں (تیسرا دیوان بھی اسی دوسرے دیوان میں شامل ہے) دیوانِ اول کی طرح یک رنگی نہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ناسخ کا یہ زمانہ افراتفری کی داستان ہے

اُن کو بار بار لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ اس عالمِ سرگشتگی میں استعاروں کے نگینے جڑنے اور نئے نئے تلازمے تراشنے کی فرصت اور فراغت کم تھی۔ اس حصّے میں دورِ اوّل کے کلام کے مقابلے میں بیان میں صفائی زیادہ ہے لیکن ناسخ کا خاص رنگ کم ہے۔ اس کا کمال دیوانِ اوّل میں نظر آتا ہے۔

دوسرے دیوان میں بہت سی غزلیں لکھنؤ کی جُدائی کے غم میں اور احباب کی یاد میں اور کسی "خاص شخص" کے فراق میں ملتی ہیں۔ ان غزلوں کی فضا، ان کی باقی غزلوں سے کچھ مختلف ہے۔ یہاں ایسا شبہہ ہوتا ہے کہ پتھر سے شرارے نکل آئے ہوں، لیکن بس شرارے، شعلے نہیں۔ بہ ہر حال یہ حصّہ کلام ان کے خاص رنگ سے علاحدہ ہے۔ اس میں کہیں کہیں جذباتی رنگ بھی آجاتا ہے۔ لیکن جو چیز ناسخ کا سرمایۂ افتخار ہے وہ مفقود ہے۔ اس کی نمود دورِ اوّل کے کلام میں پوری آب و تاب کے ساتھ ہے۔

ہاں ایک مختصر سی بات یہ بھی کہہ دی جائے کہ تصوّف سے ان کا کلام خالی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان عناصر سے بھی خالی ہے جنھوں نے فارسی و اُردو کی غزلیہ شاعری میں ماورائیت اور اخلاقیات کے ایک خاص شعبے کا اضافہ کیا ہے۔ اُس زمانے میں تصوّف کے پنپنے کے امکانات بھی کم سے کم تھے۔ تشیّع کو تصوّف سے جو بیر ہے، اُس سے سب واقف ہیں اور اُس عہد کی معاشرت کا حال بھی سب کو معلوم ہے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ ناسخ میں بھی ان عناصر کو قبول کرنے اور جذب کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ تصنّع کا تصوّف سے کیا رشتہ! آزاد نے آبِ حیات میں اسی بات کو اپنے خاص انداز میں یوں کہا ہے کہ "ان کے کلام میں تصوّف بھی ہے، لیکن اس کا رستہ کچھ اور ہے، جس سے وہ واقف نہیں۔" ناسخ کے کلام میں اس کا یہ انداز ہے:

ہے بیت ہی میں معنیِ بیتِ خیال بند　　　نزدیک ہے بہت جسے سمجھے ہیں دور ہے

تو بھی آغوشِ تصور سے جُدا ہوتا نہیں　　　اے صنم، جس طرح دور اک دم خدا ہوتا نہیں

فقر سے ایسی مری خاطر کو ہے چسپیدگی　　　محو اعضا سے نشانِ بوریا ہوتا نہیں

بحرِ وحدت میں ہوں میں، گو سر گیا مثلِ حباب　　　چوب گیا تلوار سے پانی جدا ہوتا نہیں

تصنع اور بے رنگی دونوں عیاں ہیں۔ یہ تصوف نہیں، رعایتِ لفظی کا ایک انداز ہے اور بس۔

ناسخ کے یہاں مشابہ انداز بھی پایا جاتا ہے، یعنی صائب کے انداز میں تمثیل نگاری۔ اس رنگ کے اچھے اچھے شعر ان کے یہاں ملتے ہیں، مثلاً:

پاکانِ ازل کو نہیں پروائے مربّی　　　عیسیٰ کو ضرر کچھ نہ ہوا بے پدری کا

لیکن یہ انداز فارسی و اردو میں عام ہے۔ اس میں ناسخ کی کچھ تخصیص نہیں۔ یہ اُن کے سرمایۂ شعر کا ایک حصہ ضرور ہے، اُن کی خصوصیاتِ شاعری کا لازمی حصہ نہیں۔

۶

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آج ناسخ کے کلام کی قدر و قیمت کیا ہے۔ یہ واقعی اہم سوال ہے اور اس کی ضرورت ہے کہ صفائی کے ساتھ اس پر گفتگو کی جائے۔

اردو فارسی کی اچھی غزلیہ شاعری میں، اسالیب کے اختلاف کے باوجود، بعض امور مشترک ہیں۔ جذبہ، احساس، فکر اور شاعرانہ پیرایۂ اظہار، ان کے روشن اجزا ہیں۔ ناسخ کا کلام یقیناً اس معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ احساس کی گرمی اور جذبے کی شدّت، یہ دونوں عنصر، نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اسلوب جو انھوں نے اختیار کیا، وہ بجائے خود

تاثیر دشمن ہے۔ لیکن معیار کی ایک دوسری سطح بھی ہے، جہاں صناعی کا کمال اصلی قدر وقیمت رکھتا ہے۔ معیار کی یہ دوسری سطح مختلف فنون میں اور قریب قریب زندگی کے ہر شعبے میں ملے گی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک بُت تراش اپنی تخلیق میں زندگی کی اُس حرارت کو منتقل نہ کر سکے جس کے فیض سے وہ بُت، چشمِ سخن گو کا حریف بن جایا کرتا ہے۔ یہ تو صرف اعلا درجے کی تخلیقی صلاحیت رکھنے والے افراد کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی فن کار کو باطن سے غرض ہی نہیں، وہ مسیحا نفسی کا مدعی ہی نہیں، اُس کا مطمحِ نظر تو یہ ہے کہ فنِ بُت تراشی کی صناعی کو ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت، پتھر میں نہیں، پتھر پر منتقل کر دیا جائے۔ وہ باطنی حرارت کے بجائے ظاہری آرایش اور تراش خراش کا قائل ہے اور اپنی تخلیق میں پتھر کی بیرونی سطح پر ہُنر مندی کا کمال نمایاں کر دیتا ہے؛ اِس صورت میں اس کی تخلیق کو کسی بھی معیار سے محروم کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسی تخلیقات کے لیے مسلّمہ معیار کے بجائے، فن کار کے اپنے نقطۂ نظر کا بنایا ہوا معیار پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ اس کے بغیر، ایسے فن کاروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔

ناسخ کی شاعری کو، اسی دوسرے معیار پر جانچنا ہوگا۔ فن کاری کی اپنی ایک قیمت ہے، ایک درجہ ہے۔ ناسخ کے کلام کو اس میزان پر نہیں تولنا چاہیے کہ ان کے کتنے شعر زبانوں پر ہیں یا یہ کہ کتنے شعر کسی اچھے انتخاب میں جگہ پا سکتے ہیں۔ بات منتخب اشعار کی نہیں ہے۔ ایک لہجے، انداز اور مزاج کی ہے۔ جو لوگ دہلی و لکھنؤ کی دبستانی تقسیم کے قائل نہیں، وہ بھی اس کے تو قائل ہیں کہ دونوں علاقوں کی شاعری میں مزاج کا فرق ضرور ہے۔ اور یہ مزاج وہی ہے جس کی تشکیل ناسخ کی شاعری نے کی تھی۔ یہی مزاج دبستانی اسلوب میں ڈھل گیا۔ آج ہم جو بھی فیصلہ کریں، لیکن سوال یہ ہے کہ جب یہ انداز بنا تھا، اُس

وقت اس کی ضرورت تھی یا نہیں ۔ ضرورت نہ ہوتی تو گنجایش کیسے نکلتی ۔ فروغ کیسے ملتا، بلکہ میرؔ، دردؔ، سوداؔ، جرأتؔ وغیرہ کے اسالیب کے مقابلے میں ان سے زیادہ فروغ ملا۔ جو شاعری ان مطالبوں کو پورا کرے، اس کو مطلقاً کم معیار کیسے کہا جا سکتا ہے؟ ہاں ایک خاص معیار کے مقابلے میں آپ اس کا مرتبہ جو چاہیں متعین کریں۔

لفظوں کے تلازموں سے خیالوں کی دنیا میں مفروضات کے ایسے پیکر تراشنا جن پر صناعی نے ایسی میناکاری کی ہو کہ کچھ لمحوں کے لیے آنکھیں جھپک جائیں اور ذہن متاثر ہو جائے۔ یہ بھی ایک انداز ہے ۔ اس کی اپنی ایک حیثیت ہے۔ یہ انداز ایک خاص معاشرت کی سچی ترجمانی کرتا ہے۔ جس طرح کی ملمع آلود صداقت اس معاشرے میں کار فرما تھی، اُسی طرح کی صداقت اِس شاعری میں بھی ہے ۔ مثلاً ان شعروں کو دیکھیے:

دستِ جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا　　آتشِ رنگِ حنا سے شمع ہیں سب انگلیاں

طائرِ رنگِ چمن تک مائلِ پرواز ہے　　ہم صفیر، اس باغ کی کیسی ہوا ناساز ہے

پھول جھڑتے ہیں ترے مُنہ سے جوائے رنگیں بیاں
نکتہ چیں آیا تری محفل میں، گُل چیں ہو گیا

اڑتا ہے اگر رنگِ حنا تیرے قدم سے　　رکھتا ہے فلک سر پہ، بنا کر شفق اس کو

ایسے اشعار میں میرؔ و دردؔ والی بات نہیں، جذبہ و احساس کی گرمی اور تجربے کی بازآفرینی بھی مفقود ہے، لیکن فکر کے ایک خاص انداز، معنی آفرینی کے

ایک خاص طرز اور صناعی کے ایک الگ ڈھنگ کے لحاظ سے ان کی ایک حیثیت ضرور ہے۔ ایسے اشعار کو پڑھ کر، ایک لمحے ہی کے لیے سہی، ایک تعجب آمیز مسرت کی پرچھائیں ذہن پر ضرور کانپنے لگتی ہے۔ اس ایک لمحے کے اندازِ مسرت کی بھی اپنی ایک قیمت ہے اور اس کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر پُرانی عمارت تاج محل نہیں ہو سکتی، لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ باقی سب عمارتوں کو، جو اس انداز کی کلاسکیت سے محروم ہوں، ڈھا دیا جائے، یا ان کے وجود سے انکار کر دیا جائے، یا ان کی ضرورت سے قطعِ نظر کر لی جائے۔ بہت سی عمارتیں، تاج کی طرح نفیس و نازک گل کاریوں اور تراش خراش کی بجائے، ایک خاص طرح کی صلابت سے آراستہ ہیں۔ سادے اور پُر وقار نقش۔ سنگِ مرمر کے بجائے سنگِ سرخ اور سنگِ موسیٰ۔ کیا ان عمارتوں کو قدر و قیمت سے محروم سمجھا جائے گا؟

فن کاری اور صناعی کے اس خاص کمال کے علاوہ آج ناسخ کے کلام کی حیثیت تاریخی بھی ہے کہ ان کے کلام کو پیشِ نظر رکھے بغیر اس عہد کے شعری محرکات پر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ بات صرف اُس زمانے کی نہیں ہے۔ کلامِ ناسخ نے ایک مدت تک فضا کو متاثر رکھا ہے۔ اس کے اثرات کم و بیش سو برس تک غزل پر اپنے نشانات کو ثبت کرتے رہے ہیں۔ ایسا شاعر، جس کے کلام نے اتنی طویل مدت تک اس قدر توانائی کے ساتھ اپنے اثرات کو زندہ رکھا ہو، اُس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے اور کیسے انکار کر سکتا ہے۔ بہت سی تحریکیں اپنا تاریخی رول ادا کر کے مرحوم ہو جاتی ہیں۔ اس تاریخی رول میں ایسے عناصر بھی ہوتے ہیں جن کی چمک آنے والے زمانے میں بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ زمانہ بدل جانے سے، اس تاریخی رول کی حیثیت نہ ختم ہوتی ہے نہ کم ہوتی ہے۔ اسی طرح ان عناصر کی قدر و قیمت بھی ختم نہیں ہو جاتی۔ نئے تقاضے، پُرانے عناصر کو منسوخ تو کر دیتے

ہیں، اُن کی تاریخی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے ۔

غرض یہ کہ ناسخ کے کلام کو، اور صرف ناسخ کے کلام کو کیوں، اس انداز و اسلوب کی شاعری کو مطلقاً رد کر دینا یا کسی بھی درجے کا مستحق نہ سمجھنا، جیسا کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے اور رہا ہے، درست نہیں۔ فرقِ مراتب سے کوئی زندیق ہی انکار کر سکتا ہے، مگر یہ کہاں کا انصاف اور کیسی دیدہ وری ہے کہ جو چیز آج پسند نہ آتی ہو اس کو بہ جائے خود بھی ہر خوبی سے محروم سمجھا جائے۔

ایک اور بات بھی یہاں پر صاف ہو جانا چاہیے کہ ناسخ کی شاعری میں جو صناعی ہے اور جس کے سبب سے اس کی ایک حیثیت مانی جائے گی، یہ شاعری اُس فرسودہ و پامال شاعری سے ذرا مختلف ہے، جس کی مولانا حالی نے مذمت کی تھی اور جسے عفونت میں سنڈاس سے بھی بدتر بتایا تھا۔ ناسخ کے تلامذہ و مقلدین نے یقیناً بدترین شاعری بھی کی ہے، لیکن ان سب کے یہاں ایسے حصے بھی ہیں جہاں ناسخ کی میراث کے طور پر، اُس انداز کی صناعی کا عمل دخل ہے۔ ان حصوں کی حیثیت، باقی شاعری سے یقیناً مختلف مانی جانا چاہیے۔ یوں تو میر صاحب قبلہ کے ذخیرۂ غزلیات میں تقریباً پچاس فی صدی حصہ "خرافات" کا موجود ہے۔ [یہ پچاس فی صدی کا لفظ ذرا رعایت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔] لیکن میر صاحب کی قیمت اس حصے کی بنیاد پر نہیں طے نہیں کی جا سکتی۔ عندلیب شادانی صاحب نے ضرور اس قبیل کی ایک کاوش کی تھی، لیکن اس کو جس نظر سے دیکھا گیا، اس سے سب واقف ہیں۔ جو بے دردانہ سلوک شادانی نے میر صاحب کے ساتھ روا رکھا تھا اسی طرح کا غیر منصفانہ رویہ دوسرے بہت سے لوگوں کا ناسخ کے ساتھ رہا ہے۔ وہ بھی غلط تھا اور یہ بھی غلط ہے۔

۷

ناسخ کے لیے یہ جو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایسے بے جان یا مبتذل خیالات کو بھی غزل میں داخل کیا جو اس سے پہلے، اس کا جزوِ لازم نہیں تھے، اور اس سے غزل کو بہت نقصان پہنچا؛ اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ناسخ کے بعض معاصرین، یا بعض وہ شاعر جن کا زمانہ آخر انھوں نے پایا تھا، اُن کے یہاں بھی کچھ اسی طرح کی باتیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً شاہ نصیر کے یہاں خشک و بے روح مضامین کی وہ کثرت ہے اور سنگ لاخ زمینوں کا وہ عالم ہے کہ غزل کی شاخِ نازک چٹختی، بلکہ ٹوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یا مثلاً جرأت کی چوما چاٹی والی شاعری۔ اس سلسلے میں کئی باتیں سامنے رہنا چاہیے۔ ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاہ نصیر کے غیر شاعرانہ اسلوب کو، یا جرأت و انشا کی چٹپٹی شاعری کو کبھی مثال و معیار کا درجہ نہیں دیا گیا۔ میر صاحب نے جب جرأت سے یہ کہا تھا کہ "تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو"۔ یا جب شیفتہ نے انشا کے لیے لکھا تھا کہ "ہیچ صنف را بطریقِ راسخہ شعرا نگفتہ"۔ تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس طرزِ سخن کو مثال و معیار کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

دہلی کی شاعرانہ معاشرت میں شاہ نصیر کی حیثیت ایک اُستاد کی ضرور تھی جو بنجر زمینوں کو سرسبز کیا کرتے تھے، لیکن غزل کے لیے مثال و معیار میر و درد ہی کا کلام تھا، انشا و نصیر کا نہیں۔ انشا کا قیام دہلی میں مختصر مدت تک رہا ہے، لیکن اس کا اثر یہ ہے کہ انھوں نے دریائے لطافت میں میر غفر غینی کی زبان سے مثنوی میر حسن کے ایک شعر اور رنگین کی شاعری کے متعلق جو ارشاد کرایا ہے اس سے بھی اسی کا اعلان ہوتا ہے۔ دہلی میں آخر تک غزل کا سلسلۂ نسب فارسی شاعری

سے جوڑا جاتا تھا۔

اس کے برخلاف ناسخ کے یہاں اور اُن کے تلامذہ و مقلدین کے یہاں اس انداز کی حیثیت مثال و معیار کی ہے ۔ واحد مثالی و معیاری انداز کی۔ اس اسلوب نے یہاں انفرادی اُپج یا اُمنگ کے طور پر نہیں بلکہ دبستانی اسلوب کی حیثیت سے نشوونما پایا۔ اور اس حیثیت سے نشوونما پایا کہ یہ نیا اسلوب، اُس پرانے اسلوب سے اسی طرح مختلف ہو جس طرح ایک نئی معاشرت کو پُرانی اور حریف معاشرت سے مختلف ہونا چاہیے ۔ دلّی میں اس اسلوب میں کم لوگوں نے کہا، اور جن لوگوں نے کہا تو یہ اسلوب خود اُن کی پہچان تھا، شاعری کی نہیں ۔ لکھنؤ میں یہ شاعری کی پہچان بن گیا۔

یہی وجہ ہے کہ دلّی میں جو غزل کے کئی لہجے اور انداز ملتے ہیں، یہ تنوّع لکھنؤ میں پیدا نہیں ہو سکا ۔ وجہ وہی تھی کہ ایک نئی چیز کی تشکیل کے احساس نے اس کو بنیادی اہمیت بخشی۔ چوں کہ معاشرت بھی ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی تھی، اُس رنگ میں جو اس اسلوب سے میل کھاتا تھا، اس لیے یہی ایک رنگ اصل قرار پایا۔ ہر شخص نے اسی کو پسند کیا اور اختیار کیا۔ ناسخ اس کے نقیب کہلائے۔ تصور کو تحریک بنا دینا، معمولی آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ناسخ عہد آفریں شخصیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ ان کی مقناطیسی شخصیت نے ایسے لوگوں کا بڑا گروہ پیدا کیا اور اس کی تربیت کی جس نے ان کی روایت کو اور مستحکم کیا اور فروغ بخشا۔ اور یہ شخصی نہیں دبستانی اسلوب بن گیا۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ اوروں کے یہاں صرف ایک عنصر تھا، مشکل گوئی۔ ناسخ کا اسلوب کئی عناصر سے مرکب ہے اور یہ کئی عناصر اس امتزاج کے ساتھ اور کسی کے یہاں نہیں پائے جاتے ۔

دہلی والوں میں شاہ نصیرؔ اپنی بے روح شاعری اور اپنے بے لطف اندازِ بیان کے لیے بہت بدنام ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ اُن کے انداز نے ناسخؔ کو یا وہاں کے دوسرے لوگوں کو متاثر کیا ہوگا۔ مصحفیؔ نے ریاض الفصحا میں اس سلسلے میں بہت اہم بات لکھی ہے، جس سے حقیقتِ حال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے نصیرؔ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ :

"در شاہجہان آباد علمِ استادی می افرازد .... البتہ در روانیِ طبعش شکی نیست اماچوں در لکھنؤ گزر افگندہ، دبا فصحاے ایں دیار ملاقات کرد، و در مشاعرہ ہا غزلِ طرحی گفتہ خواندہ، مرتبۂ سخنِ بلند اورا معلوم شد"۔

یہ تحریر اُس وقت کی ہے جب مصحفیؔ کے الفاظ میں نصیرؔ کی عمر ساٹھ برس سے متجاوز تھی۔ مصحفیؔ کے لکھنے کے بموجب لکھنؤ میں ان کو "مرتبۂ سخنِ بلند" معلوم ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ناسخؔ کی مضمون آفرینی شہرت پیدا کر رہی تھی۔ آزادؔ نے آبِ حیات میں جو کچھ لکھا ہے اور جس میں سرِ مشاعرہ نصیرؔ پر اعتراض کا ذکر بھی ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ لکھنؤ والوں کے نزدیک شاہ نصیرؔ کی شخصیت کچھ ایسی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ دکن میں شاہ صاحب کو خوب فروغ ہوا۔ وہاں اور تھا کون۔

شاہ نصیرؔ کے یہاں اصل چیز ان کی سنگ لاخ زمینیں ہیں۔ "عسل کی مکھی"، "سر پہ طرہ ہار گلے میں"، "زمیں پہ بجلی فلک پہ باراں" جیسی۔ یہی ان کا اصل کمال ہے۔ ناسخؔ کے یہاں آپ اِس قبیل کی زمینیں نہیں پائیں گے۔ مشکل زمینیں ہیں لیکن بالکل دوسرے رنگ کی جیسے "زنجیر چاندی کی۔ یا کوا اڑا چاہیے"، یا ایسی ہی بعض اور زمینیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کی اکثر و بیشتر زمینیں بجائے خود شگفتہ ہیں۔ اسی سے ظاہر ہے کہ ناسخؔ نے نصیرؔ کو حریفِ مقابل نہیں سمجھا، تقلید کیا کرتے۔ شاہ نصیرؔ کے یہاں جو چیز معراجِ کمال یا معیارِ کمال ہے، ناسخؔ

کے یہاں اُس کا گزر نہیں ۔ اس کے بجائے ، متعدد دوسرے عناصر ہیں جن سے شاہ نصیر کا دامن خالی ہے ۔ ادنا مماثلت کو اثر پذیری یا تقلید نہیں کہہ سکتے ۔

۸

مصحفی کے مقدمۂ دیوانِ ششم (غیر مطبوعہ) کی عبارت کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے، اس سلسلے میں بعض امور کی وضاحت ضروری ہے ۔ اس مقدمے میں مصحفی نے اور باتوں کے علاوہ صاف الفاظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ناسخ نے عرصۂ قلیل میں ریختہ گویانِ سادہ کلام کے طرز پر خطِ نسخ کھینچ دیا تھا ۔ آتش نے بھی اسی راستے کو اختیار کیا اور میں نے بھی اس دیوان کی اکثر غزلیں انھی کے طرز میں کہی ہیں ، اگرچہ میں گروہِ سادہ گویاں سے تعلق رکھتا تھا ۔ اس کے علاوہ ، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سادہ گوئی کے بجائے اس نئے معنی آفریں طرز کو کیوں اپنایا تھا ۔ صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر میں اس کو نقل کیا ہے ۔ قاضی عبدالودود صاحب نے ایک علاحدہ مضمون میں (مطبوعۂ معارف ۷۲، جلد ۴۰) اس کو زیادہ صحت اور ضروری حواشی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ میرا ماخذ، قاضی صاحب کا یہی مضمون ہے ۔ اس اہم عبارت کا متعلقہ حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی کو حریفوں کا کیسا سخت سامنا رہا ہے :

" درایامیکہ فقیر بسببِ کساد بازاریِ متاعِ گران بہای کلامِ فارسی، بمقتضای رواجِ زمانہ ، خود را مشغول باین شغلِ خطیر داشت ؛ عالمی از حسدِ ہمکاری، جامہ در خم نیل زدند ۔ وجمعی کور باطن منغص شدہ ، گاہیکہ پنجہ افگندند، پیش نبردند ۔ بس از انقضای ایامِ چند چون سلسلۂ موزونیت دراز

کشیدہ ، بقولِ حافظ :

دورِ مجنون گذشت، نوبتِ ماست ہر کسی پنجروزہ نوبتِ اوست

حضرۂ الوانِ این خوان، شیخ ناسخ ، کہ یکی از دہقانانِ محمد علیٰ تنہاست ، دلبفقیر ہم رسوخی از تہِ دل دارد ، مقسوم گشت ۔ تخلصِ خود را اسم بامسمیٰ انگاشتہ ، برطرزِ ریختہ گویانِ سادہ کلام در عرصۂ قلیل خطِ نسخ کشید ۔ و از تعاقبش برقدم او خواجہ حیدر علی آتش ہم در رسیدہ ، سمندِ تیزگامِ خیال را از دائرۂ چرخِ اثیر بیرون برد ۔ وہمچنین ثالثِ ایشان طالب علی عیشی تخلص بہ تیغِ دوزبانِ نظم و نثر ذوالفقارِ علی از نیام بردہ (کذا) سرِ اعادیِ باطل آہنگ را ببرید ن داد ۔ تا آنکہ معاندین و دعویٰ داران بسوراخِ موش خزیدند .... اگرچہ عاصی ہم از گروہِ سادہ گویان بود لیکن بفیضِ صحبتِ بزرگان در فنِ فارسی مہارتِ کلّی داشت ۔ بلکہ ریختۂ خود را مہمانِ طفیلیِ فارسی میدانست ۔ در مجلس ہای مشاعرہ از روی این صاحبان کہ اقرارِ استادیِ من بہ نفس الامر دارند، خجالتی نکشید ، بلکہ غزلہاتِ این دیوانِ ششم را اکثری بہ ردیفِ ایشان گفتہ .... در ۱۲۲۴ھ نبوی در بلدۂ لکھنؤ تحریر یافت "

اس عبارت سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) بعض معاصر شاعر مصحفی سے حسد رکھتے تھے ۔ کئی بار مقابلہ کیا لیکن پیش نہیں لے گئے ۔ (۲) ناسخ نے سادہ گو شاعروں کے کلام پر خطِ نسخ کھینچ دیا تھا ۔ بہت کم عرصے میں ان کا طرز مقبول ہو گیا تھا (۳) آتش نے ناسخ کے انداز کی پیروی کی ۔ مصحفی نے بھی سادہ گو ہونے کے باوجود ، اس کے بعد مشاعروں میں شرمندگی نہیں اُٹھائی ، بلکہ اکثر غزلیں انھی لوگوں کے انداز میں ، یعنی اُس انداز میں جس کو ناسخ نے فروغ دیا تھا اور جس کی آتش نے تقلید کی تھی ، کہیں ۔ (۴) چھٹے دیوان کی بیشتر غزلیں اسی انداز میں کہی گئی ہیں ۔ یعنی یہ دیوان اس نئے

طرز میں ، یا طرزِ ناسخ میں مرتب ہوا ہے (۵) یہ تحریر ۱۲۲۴ھ کی ہے۔
یہ معلوم ہے کہ جرأت اور انشا دونوں سے مصحفی کی چشمک تھی۔ انشا سے جھگڑے کا حال تو زیادہ مشہور رہے۔ جرأت سے اختلافات کے متعلق قاضی صاحب کا مضمون مصحفی اور جرأت" دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ معاصر کے دوسرے شمارے میں شامل ہے۔ تذکرۂ ہندی میں اپنے شاگرد منتظر کے ترجمے میں یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگ ان کو مجھ سے توڑنا چاہتے تھے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اور" حالا برای کلہ شکنی آنہا با من موجود است"۔

یہ بات بھی معلوم ہے کہ لکھنؤ میں مصحفی نے شاگردوں کا بڑا لشکر جمع کر لیا تھا۔ صاحبِ دستور الفصاحت نے لکھا ہے:

"در ایامیکہ واردِ لکھنؤ گردیدہ ، آنوقت دور دورِ میان جرأت بود۔ و مردمِ شہر ہمہ مسخرِ طرزِ دلپسندِ او۔ مشارٌ الیہ چون دید کہ کسی ملتفت بحالش نمیشود ، با جرأت طرحِ خلاف انداختہ .... ودر اندک عرصہ خود ہم شاگردانِ بسیار بہم رساندہ ، در مشاعرہ ہای لکھنؤ شعر میخواند .... آخر نامِ نامیِ خود مثلِ او بلکہ زیادہ تر ازو بر جریدۂ شہرت دنام آوری ثبت نمود"

یہ زمانہ معرکہ آرائیوں کا تھا۔ اور وسائل کے علاوہ شاگردوں کی بڑی تعداد بھی اس کے لیے ضروری تھی۔ شہرت کے لحاظ سے اُس وقت ایک طرف تو جرأت کا طرز تھا، جس پر مصحفی نے "چھنالے کی شاعری" کی پھبتی کسی ہے:

گر چہ چلا بھی ہوئے، تو ہاں سوز کا سا ہو　　کس کام کی وگرنہ چھنالے کی شاعری

یہی نہیں، جعفر علی حسرت (استادِ جرأت) کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

بعضوں نے پھر تو شعر پہ حسرت کے یہ کہا　　کیا دال موٹھ بیچنے والے کی شاعری

دوسری طرف ناسخ ایک نئے طرز کی طرح ڈال رہے تھے اور یہ نظر آتا تھا کہ اب

مستقبل کا مقبول طرز بھی ہوگا۔ اُستادی کی حُرمت تو برقرار رکھنا ہی تھی اور اس کے لیے شاگردوں کا لاؤ لشکر بھی ضروری تھا اور شاگردوں کو ثابت قدم رکھنے کے لیے دل کشی کی زنجیر بھی درکار تھی۔ اگر مشاعرے میں شاگردوں کی غزل نہیں چمکتی، تو پھر اُستاد کو پوچھتا کون۔ خود مصحفی کا اپنا کوئی طرز نہیں تھا۔ وہ تو ہر رنگ میں کہ لیتے تھے۔ اُستاد تھے، لیکن کسی خاص رنگ کے مالک نہیں تھے۔ مزاج پر انتخابیت غالب تھی۔ اس لیے یہ ناگزیر تھا کہ جب ناسخ نے ایک نئے اور نہایت درجہ ظاہر فریب طرز کو فروغ دیا، تو مصحفی اُس سے متاثر ہوتے۔ یہ مصحفی کے مزاج کا بھی تقاضا تھا، لیکن اس سے زیادہ اُس ماحول میں اور اُن جتھے بازی کے حالات میں اس کی ضرورت تھی۔ اِس کے بغیر وہ نئے شاگردوں کو متاثر نہیں کر سکتے تھے، اور پُرانے شاگردوں کو وفاداری پر ثابت قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور شاگردوں کے بغیر دنگل جیتے نہیں جا سکتے تھے۔

آزاد نے آبِ حیات میں ایک روایت درج کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی غزلیں فروخت بھی کیا کرتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہو تو تعجب کی بات نہیں ہوگی ایسی اور مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ان کی مالی حالت اچھی ہو، اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ البتہ اس کی شکایت وہ ضرور کرتے ہیں کہ آج کل رئیس اپنے استاد کو وہ تنخواہ دیتے ہیں جو "سائیس کے لائق" ہے۔ ان کی معاشی پریشانیوں کا اندازہ، ان کی اپنی تحریروں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ بہ ہر طور، غزلیں خریدنے والے، صرف اس صورت میں غزلیں خرید سکتے تھے اور مناسب قیمت دے سکتے تھے، جب کہ مشاعرے میں وہ سر سبز بھی ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ مشاعرے میں سر سبزی انھی غزلوں کو نصیب ہوگی جو طرزِ حال سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۱۲۲۴ھ میں، جیسا کہ مصحفی نے لکھا ہے، ناسخ کے طرزِ نو کی شہرت تھی۔ اِس طرز نے پرانی سادہ گوئی کو منسوخ کر دیا تھا۔ ہر طرف اس معنی آفریں انداز کی دھوم مچی ہوئی ہوگی۔ ان حالات میں آدمی میر تقی میر ہو

تب تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب سے الگ اور سب سے مختلف بات کہے اور اُس کی پگڑی سلامت رہے۔ عام آدمی کو اسی آواز پر آواز دینا ہوگی۔ اب اگر مصحفی اس نئے طرز کو نہ اپناتے تو کرتے کیا۔ مسئلہ صرف ان کی ذات کا نہیں تھا، پوری امت کی بات تھی۔ خود بھی مشاعروں میں کامیاب ہونا تھا اور اپنی اس امت کو بھی بخشوانا تھا۔ عزت وحرمت کے ساتھ ساتھ معاش کا مسئلہ بھی وابستہ تھا۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کے مزاج پر انتخابیت غالب ہوتی ہے، وہ ہر معروف طرز میں کامیابی کے ساتھ کہہ لینے کو لازمۂ استادی سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اپنا کوئی انداز نہیں ہوتا، نہ بن پاتا ہے، لیکن مختلف اسالیب کی نقل کرنے کا کمال ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ طبعاً مجبور ہوتے ہیں کہ اساتذۂ معروف (وہ ماضی کے ہوں یا حال کے) کے رنگ میں دیوان مرتب کریں یا اپنے زمانے کے کسی معروف یا چھائے ہوئے اسلوب کی بھی پیروی کریں اور دادِ سخن سرائی دیں اور اس طرح یہ ثابت کر دیں کہ ہر فن میں ہوں میں طاق۔ اور یہ کہ دیکھو، استادی اسے کہتے ہیں۔ ایک زمانے میں اس صفت کو واقعتہً کمالِ استادی سمجھا جاتا تھا۔ مصحفی نے قریب قریب بیش تر صاحبِ طرز اساتذۂ اردو (میرؔ، دردؔ، سوداؔ، سوزؔ، جرأتؔ، انشاؔ) کے رنگ میں غزلیں کہی ہیں۔ اُردو ہی نہیں، فارسی کے بعض اساتذہ کے انداز میں بھی دادِ سخن دی ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ میں نے ایک دیوان نظیریؔ نیشاپوری کے جواب میں مرتب کیا تھا، ایک اور دیوان بھی تھا "کہ زبانِ آن بطورِ جلال اسیر و ناصر علی بود" (تذکرۂ ہندی)۔ نظیریؔ اور جلالؔ اسیر کا طرز بالکل مختلف ہے، لیکن انھوں نے دونوں طرزوں میں دیوان مرتب کر لیے۔ اس سے ان کے مزاج کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں انھوں نے جہاں میرؔ و دردؔ کے انداز میں شعر کہے اور جرأتؔ کی شاعری کو بُرا سمجھنے کے باوجود ان کے انداز کو بھی اپنایا، وہاں ناسخ

کے طرز میں بھی ایک دیوان کا سرمایہ فراہم کرلیا۔

یہ ہے اصل حیثیت تقلیدِ طرزِ ناسخ کی۔ لیکن ان سب امور کے باوصف اس نوع کی معنی یابی کے متعلق اُن کی اصل رائے کیا تھی، اِس کا اندازہ اُس عبارت سے بہ خوبی ہو سکتا ہے، جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد، واجد لکھنوی کے متعلق لکھی ہے:

"بدایتِ شعرش علی الرسم زمانہ بود۔ آخر بطورِ شوکت بخاری، سمندِ خیالش بطرفِ معنی بندی و نازک خیالی عطفِ عنان نمودہ ۔۔۔۔ اگرچہ فقیر اشعارِ خیالی را دوست ندارم، برای خاطرش این چند بیت از انتخاب او کردہ (کذا) بقلم دادہ ام"

(ریاض الفصحا)

اُن کے اِن اشعار کو بھی دیکھیے:

مصحفی، نظمِ غزل کے گرچہ عالم ہیں کئی
دل مرا مائل ہے لیکن پاس وحرماں کی طرف

اے مصحفی، قدرِ مرغِ بُستاں ہرگز
کھتا نہیں گو کہ ہو سے یا ناکوا

الفاظِ متین اور لغت لا لاکر
ہرگز نہ بنا تو ریختے کو ہوّا

یہ شعر اُن کے دیوانِ پنجم کے ہیں (ماخوذ از مقالۂ قاضی عبدالودود صاحب۔ معارف جلد؟)

مصحفی نے اپنے آپ کو گروہِ سادہ گویاں میں شمار کیا ہے۔ وہ تھے بھی سادہ گو۔ اُردو کے اچھے اشعار کے انتخاب میں ان کے بہت سے شعر جگہ پائیں گے اور بہت اچھے اشعار کے انتخاب میں بھی ان کے شعر لازماً شامل ہوں گے اور یہ سب شعر سادہ گوئی کی صفت سے متصف ہوں گے۔ وہ بہ قولِ خود "اشعارِ خیالی" کو پسند بھی نہیں کرتے تھے، لیکن زمانے کی پسند سے مجبور تھے۔ اپنے مزاج کی انتخابیت سے قطعِ تعلق نہیں کر سکتے تھے، اور اپنی اُستادی پر حرف آتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اُن کو جرأت کے رنگ میں بھی کہنا پڑا ہے، کیوں کہ یہ رنگ ایک زمانے میں چھایا ہوا تھا، لیکن اس اظہار سے

سے بھی باز نہیں رہ پاتے کہ:

ہیں آپ ہی معاملہ گوئی پر اپنی شاد　　　　لعنت برین معاملۂ عشقِ پُر فساد

اور یہ بھی کہ:

گر جو چلا بھی ہوئے تو ہاں سوز کا سا ہو　　　　کس کام کی وگرنہ چھنالے کی شاعری

ایک عمر دہلی میں گزاری تھی، لیکن زندگی کے آخری تیس سال لکھنؤ میں گزارے۔ دہلوی سادہ گوئی پر ایمان تھا۔ اس انداز میں اچھے شعر بھی کہے ہیں اور بہت اچھے شعر بھی کہے ہیں لیکن مجبور تھے کہ "چھنالے کی شاعری" کی بھی تقلید کریں اور معنی آفرینی اور حسن اشعار کی طرف بھی توجہ کریں۔ اس میں پسند یا ناپسند کو دخل نہیں تھا، ناگزیر حالات کا یہ نتیجہ تھا۔ ہر شخص میر صاحب نہیں بن سکتا۔

ناسخ کی زبان

ناسخ کی زبان کے متعلق چند باتوں کی وضاحت ضروری ہے :
شاعری کے تذکرے میں آج جب بھی زبانِ لکھنؤ کا ذکر آتا ہے، تو ایک بہت رچی ہوئی زبان کا تصور ذہن میں ہوتا ہے۔ شیرینی و لطافت میں ڈوبی ہوئی زبان جس کی روانی و فصاحت کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ لیکن اس زبان کو ناسخ سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ غلط فہمی نے کچھ یہ خیال دلوں میں ڈال دیا ہے کہ زبانِ لکھنؤ کے اس تصور سے مراد ناسخ کی زبان ہے۔ یا یہ کہ کم از کم اس زبان کی صورت گری انھی نے کی ہے۔ اور یہ نہیں تو اس کا قالب تو بنایا ہی ہوگا۔
جس وقت ناسخ کی شاعری کا آغاز ہوا ہے، اُس وقت مجموعی طور پر غزل کی زبان وہی تھی جو دہلی سے آئی تھی اور وہاں رائج تھی۔ اس وقت زبان کے کئی واضح انداز یا روپ موجود تھے : ایک تو وہ زبان جس کو جرأت کی معاملہ بندی اور لذت نگاری نے بنایا سنوارا تھا۔ رنگین کی ریختی نے اس کا ایک اور ضمنی روپ ابھارا جس میں لوچ، لچک اور صفائی بہت زیادہ تھی۔ عربی فارسی کے بوجھل لفظوں سے پاک، خواتین کی خاص فرہنگ سے معمور اور روزمرہ و محاورے کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی۔
دوسرا انداز وہ تھا جو میر و مصحفی ساتھ لے کر آئے تھے۔ اور اب اس کے منفرد نمایندہ میر صاحب تھے۔ اس میں لذتیت کے بجائے دردمندی کا دھیما پن پایا جاتا تھا۔ عربی فارسی لفظ تھے لیکن اعتدال کے ساتھ۔ ہندی لفظوں سے بے گانگی نہیں تھی پُرانے پن کی جھلکیاں اس پر صاف نمایاں تھیں۔
اسی انداز کی ایک صورت وہ تھی جس پر میر حسن کی تصویر کشی کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ صاف، براہِ راست، سادہ، بیانیہ عناصر سے معمور۔ میر صاحب، مصحفی اور میر حسن

کی زبانوں میں معمولی سے فرق کے علاوہ کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ بنیادی طور سے یہ ایک ہی انداز تھا۔

ایک وہ انداز تھا جس پر سودا کی بلند آہنگی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس میں عربی فارسی لفظوں کا اوسط کچھ زیادہ تھا۔ ترکیبوں کا حصّہ بھی نسبتہً زیادہ تھا۔ ایسے لفظوں کی کثرت تھی جن میں صوتی اعتبار سے بھاری پن پایا جاتا ہے۔ قصیدہ نگاری نے ایسے لفظوں کے اوسط کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔

انشا کی زبان میں فارسی عربی کے لفظوں، جملوں اور فقروں کی بہتات کے ساتھ ساتھ ایک عجیب طرح کی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ وہ کسی زمین میں غزل کہیں، سنجیدگی ہو یا چلبلا پن، ہندی لفظوں کا اوسط زیادہ ہو یا فارسی عربی لفظوں کا، ہر صورت میں لفظوں کی ترتیب کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ اس سے موسیقی کی لہریں سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ روانی و چاشنی اس کا جوہر ہے۔ بندشوں کی چستی، زبان کی موسیقیت کو اور تیز کر دیتی ہے۔ یہ بات اُن کے معاصرین میں سے کسی کی زبان میں نہیں پائی جاتی۔

اب آپ ناسخ کی زبان کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے یہاں زبان کی دو سطحیں یا دو روپ ہیں؛ ایک تو وہ جو نسبتہً سادہ و صاف اشعار میں نمایاں ہے۔ لیکن اس شاعری کا بیشتر حصّہ تقلیدی ہے۔ یعنی شعرائے دہلی کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے (اس کی بحث اوپر آچکی ہے)۔ یہ زبان اُس زمانے کی زبانِ دہلوی جیسی ہے۔ یعنی وہ زبان جو مصحفی اور حسرت کے یہاں پائی جاتی ہے، جس کا ایک روپ جرأت کی سادہ گوئی اور صاف گوئی میں نظر آتا ہے۔ مضامین سے قطعِ نظر کیجیے تو اس زبان میں اور جرأت و مصحفی کی دورِ آخر کی زبان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ملے گا۔ اس میں کوئی انفرادیت نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں جس کی بنا پر اس کو زبانِ لکھنؤ

یا زبانِ ناسخ کے نام سے موسوم کیا جا سکے۔ ناسخ کے کلام میں اس کا حصہ بھی بہت کم ہے۔ جس طرح اس طرح کے سادہ وصاف اشعار ناسخ کے نمایندہ اشعار نہیں، یہ ان کے طرز کو ظاہر نہیں کرتے، اسی طرح یہ سادہ زبان بھی ناسخ کی زبان کی نمایندگی نہیں کرتی۔

ناسخ کی حقیقی شاعری، جو ان کے خاص انداز کی نمایندگی کرتی ہے، وہ وہی ہے جس میں سادگی و لطافت کو دخل نہیں۔ یہ زبان کے لحاظ سے متاخر شعرائے لکھنؤ کی زبان سے مختلف ہے۔ یہ نامانوس لفظوں، دور کے استعاروں اور بوجھل بندشوں کا مجموعہ بلکہ ہیبت کدہ ہے۔ یہ زبان مرزا دبیر کی ثقالت آب زبان کی بنیاد تو بن سکتی تھی، واجد علی شاہ، نواب مرزا شوق اور میر انیس کی لطیف، بامحاورہ اور شفاف زبان کی بنیاد نہیں بن سکتی تھی۔ زبانِ لکھنؤ کا جب بھی نام لیا جاتا ہے تو متقدمین میں سے انیس و شوق کی زبان کا تصور ذہن میں ہوتا ہے اور متاخرین میں سے جلال و امیر کی زبان سامنے ہوتی ہے۔ انیس و شوق کا کیا ذکر، ناسخ کی زبان کو جلال و امیر کی زبان کے مقابلے میں رکھ کر دیکھیں تو اندھیرے اجالے کا فرق نظر آئے گا۔

ناسخ کے یہاں اس صفائی و سادگی کا کوسوں پتا نہیں جس کو جرأت اور رنگین نے چمکایا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک روانی، فصاحت، سلاست، محاورہ بندی اور لطافت کا تعلق ہے، ناسخ نے ان عناصر کو اپنی زبان سے دور رکھا ہے۔ گویا اس وقت تک زبان میں اس سطح پر جو ترقی ہو چکی تھی اس کو روک دیا اور زبان کو کچھ اضافوں کے ساتھ سودا کے انداز سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ یہ معکوس ترقی تھی۔

جہاں تک عام زبان کی فصاحت اور روانی کا تعلق ہے، اس سلسلے میں

زبانِ لکھنؤ ناسخ کی ممنون نہیں، بلکہ شاکی ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے زبانِ لکھنؤ ممنون ہے مصحفی، میر حسن اور جرأت و رنگین کی جن کے انداز کو بعد والوں نے فروغ دے کر، اُس زبان کی صورت گری کی جس کو آج ہم زبانِ لکھنؤ سے موسوم کرتے ہیں۔

ناسخ ایسے لفظ بے تکلف نظم کرتے ہیں جن کو کسی تکلف کے بغیر نامانوس اور بوجھل کہا جا سکتا ہے۔ ان کے پورے کلام میں زبان کی سطح پر ایک خاص طرح کا کُھردراپن پایا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نے موازنے میں فصاحت کی جو تعریف کی ہے اگر اس کو صحیح مانا جائے، اور یقیناً صحیح مانا جائے گا، تو پھر ناسخ کی زبان پر فصاحت کی تعریف مشکل سے صادق آ سکے گی۔

ناسخ کے اہم معاصرین میں سے آتش کے کلام میں ناہمواری کا یہ انداز نہیں ملتا۔ شاعری ہی کے لحاظ سے نہیں، فصاحتِ کلام کے لحاظ سے بھی آتش کو ناسخ پر برتری حاصل ہے۔ یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ آتش مصحفی کے شاگرد تھے۔ آتش کی غزلوں میں زبان کا وہ لُطف بھی پایا جاتا ہے جو آگے چل کر جلال و امیر وغیرہ کے یہاں زیادہ صفائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔

نواب مرزا شوق کی زبان، ناسخ کی زبان سے کس قدر مختلف ہے۔ اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ شوق کے یہاں عورتوں کی خاص زبان کا حُسن نمایاں ہے۔ بیان کی صفائی، روزمرہ کا حُسن، بوجھل لفظوں سے پرہیز، محاوروں کا برجستہ استعمال جیسے نگینے جڑ دیے گئے ہوں، اور فصاحتِ کلام کا جوہر، اس زبان کا سرمایہ ہے۔ غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ جرأت اور رنگین کی زبان کا ترقی یافتہ روپ ہے۔ زیادہ چمک دار، زیادہ روشن، زیادہ شفاف اور زیادہ لطیف۔ اس زبان میں اور ناسخ کی زبان میں اختلاف کی نہیں، تضاد کی نسبت ہے۔

میر انیس کی زبان کا سلسلۂ نسب میر حسن سے ملتا ہے۔ آزاد کی روایت کے مطابق، میر انیس کسی جلسے میں اپنا کلام سناتے تو بعض محاورے پر اتنا کہہ اٹھتے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے، حضراتِ لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔

میر انیس کے والد میر خلیق، مصحفی کے شاگرد بھی رہے تھے۔ میر خلیق کے متعلق آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ وہ غزلیں فروخت بھی کیا کرتے تھے۔ جب لکھنؤ میں آتے تھے تو پیر بخارا میں ٹھہرا کرتے تھے۔ "ایک دن ایک خریدار آیا اور اپنا تخلص ڈلوا کر، شیخ ناسخ کے پاس پہنچا کہ اصلاح دے دیجیے۔ شیخ صاحب نے غزل کو پڑھ کر، اُس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا: ابے، تیرا مُنہ ہے جو یہ غزل کہے گا۔ ہم زبان پہچانتے ہیں، یہ وہی پیر بخارا والا ہے۔"

روایت صحیح ہو یا غلط، لیکن بین السطور میں جو مفہوم ہے، اصل بات وہ ہے۔ ناسخ نے لطیف و با محاورہ زبان کی نہیں، ایک نئے شعری انداز کی تشکیل کی ہے، جو اُن سے پہلے اُن سب خصوصیتوں کے ساتھ ایک مستقل اور منفرد اسلوب کی حیثیت سے وجود میں نہیں آیا تھا۔ وہ زبانِ لکھنؤ، جس کی اب تک دھوم مچی ہوئی ہے، شیرینی و نفاست جس کا جوہر ہے، اور جس کی لطافت کی قسم کھائی جا سکتی ہے، وہ ناسخ کی زبان نہیں، اُن لوگوں کی زبان ہے جن کو ناسخ سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ لکھنؤ کی لطیف و فصیح زبان کا معیار اگر نواب مرزا شوق اور میر انیس کی زبان کو مانا جائے، تو پھر ناسخ کی زبان کو اس کا حریف ماننا پڑے گا۔

ناسخ نے جس نئے انداز کی تشکیل کی تھی اور جس نے مصحفی کے الفاظ میں سادہ گوئی پر خطِ نسخ کھینچ دیا تھا، اُس انداز کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ اُن سب خصوصیات کے ساتھ، وہ بامحاورہ زبان سے ربط نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ اس میں جس آہنگ کی اہمیت تھی اور دور کے استعاروں نے تلازموں کے جو نئے نئے رُخ نمایاں کیے تھے،

یہ دونوں اہم عنصر، نہایت درجہ شفاف، نرم اور رواں زبان سے اپنا رشتہ استوار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اِن دونوں میں ایک طرح کا تضاد ہے۔ معنی آفریں شعرا ہوں یا خیال بند شعرا، ان کو بہت شفّاف زبان یوں بھی راس نہیں آتی۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی زبان میں محاوروں کی جگہ استعارے گھیر لیتے ہیں، اس لیے بامحاورہ زبان کا حُسن نمایاں ہو ہی نہیں پاتا۔ ہاں معنی آفرینی کی بہت معمولی سطح پر محاوروں کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔ ذوق کی زبان میں یہی بات ہے۔ اُن کے یہاں محاورے کا لُطف بہت زیادہ ہے، معنی آفرینی کا حصّہ کم ہے، اس کی سطح نیچی ہے۔ اسی کو "اُردو پن" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ذوق کی اہم خصوصیت ہے۔

اس پہلو کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بھی یہ ہوا ہے کہ ناسخ جیسے معنی آفریں اور سادگی دشمن شاعر سے اُس زبان کی توقع روا رکھی گئی جو اُن کے اندازِ خاص سے میل نہیں کھا سکتی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ ناسخ کے یہاں ایک رجحان یہ بھی کارفرما تھا (اور یہ نئے نئے تلازموں کی جستجو کا نتیجہ تھا) کہ نامانوس لفظوں کو بالجبر غزل میں داخل کیا جائے۔ اس طرزِ عمل نے اس لطافت کو بھی ٹھیس لگائی جو کسی نہ کسی صورت میں خیال بند اور معنی آفریں شعرا کے پیرایۂ اظہار میں کارفرما رہا کرتی ہے۔

ناسخ کے شاگردوں نے ناسخ کے انداز کو ضرور اپنایا، لیکن بوجھل لفظوں کے دباؤ کو بھی کم کیا۔ ناسخ کے یہاں جو پُرزور آہنگ تھا، اور جو اُن کے اسلوب کا نمایاں جز ہے، وہ بھی اِن لوگوں کے یہاں مدھم پڑ گیا۔ یہ شخصیت کا فرق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ناسخ کے تلامذہ اور ان کے بعد والوں کے یہاں تدریجی طور پر زبان میں لطفِ محاورہ اور حسنِ بیان کا رنگ نکھرتا گیا۔ یہاں تک کہ جلال وغیرہ کے یہاں جو خاندانِ ناسخ ہی سے تعلق رکھتے ہیں، زبان کی عام سطح، ناسخ و رشک کی زبان کی سطح سے خاصی مختلف ہے۔

یہ بہرحال مسلّم ہے کہ ناسخ نے جس نئی روح کو غزل کے کالبد میں پھونکا تھا، وہ برابر قالب بدلتی رہی۔ یہاں تک کہ امیر مینائی کے یہاں بھی اس کی جلوہ گری صاف نظر آتی ہے۔ لیکن اس مدت میں غزل کی زبان، ناسخ کے مقابلے میں بہت صاف ہو چکی تھی، اس لیے ثقالت کا رنگ نہیں چمک سکا۔ اس کے باوجود جلالؔ و امیرؔ کے یہاں محاورے اور روزمرّہ کا وہ لطف نہیں جو مثلاً ان کے دہلوی معاصر داغؔ کے یہاں نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ غزل گوئی کی حد تک، امیرؔ و جلالؔ تک ناسخ کی زبان پہنچی تھی بعض تبدیلیوں کے ساتھ۔ لیکن داغؔ کو ذوقؔ کی زبان ورثے میں ملی تھی، جس میں اصل حیثیت محاورہ بندی کی تھی۔ داغؔ نے اس زبان کو اور جِلا دی اور اس میں تغزّل کے لطف کو بھی شامل کیا، جس سے ذوقؔ کا کلام خالی تھا۔ اور اس طرح زبانِ داغؔ اپنے زمانے میں بے مثالیت کے مرتبے پر فائز تھی۔ جلالؔ و امیرؔ کی زبان میں بھی حُسن، لطف، پاکیزگی، صفائی، سب کچھ ہے لیکن روزمرّہ اور محاورے کا وہ انداز نہیں جس سے داغؔ کا کلام الگ پہچانا جاتا ہے اور جس نے داغؔ کی زبان میں شگفتگی کے ایک نہایت روشن عنصر کا اضافہ کیا ہے۔ اس کو یوں بھی دیکھیے کہ داغؔ کے یہاں امیرؔ و جلالؔ وغیرہ کے مقابلے میں عربی فارسی لفظ نسبتہً کم ملیں گے۔ ترکیبوں کی بھی یہی صورت ہے۔ ناسخ کا کلیات، زبان کے لحاظ سے نہیں، ایک خاص اسلوب کے لحاظ سے بیاضِ مسیحا کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس اسلوب نے ایک مدّت تک حکومت بلکہ خدائی کی ہے۔

اصلاحِ زبان اور ناسخ

اِس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم غلط فہمی یہ ہے کہ ناسخ نے زبان کی اصلاح کی۔ اور اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ متاخرین کے یہاں قواعدِ شاعری، متروکات اور تذکیر و تانیث کی جو بحثیں عام رہی ہیں، ان سب کی شیرازہ بندی ناسخ نے کی تھی۔ صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرے جلوۂ خضر میں اصلاحاتِ ناسخ کی لمبی چوڑی فہرست درج کی ہے۔ بعد کے لوگوں نے، جن میں صاحبِ شعرالہند خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، یہیں سے بات اُڑائی ہے اور اب اس مفروضے کی حیثیت آیت و حدیث کی سی ہے۔ صفیر بہ یک واسطہ ناسخ کے شاگردوں کے زُمرے میں شامل ہیں۔ جلوۂ خضر کے دوسرے حصے کو جن لوگوں نے پڑھا ہے وہ اس سے اتفاق کریں گے کہ اس کا مقصد محض یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کو عبقری عصر ثابت کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ متاخرین، زبان و قواعدِ شاعری کے معاملے میں شیخ صاحب کے ممنونِ کرم ہیں۔

ہوا یہ ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ناسخ کے اسلوب کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے، اُس کو اصلاحِ زبان کا مرادف سمجھ لیا گیا۔ اُس عہد میں جو تذکرے لکھے گئے، اُن میں صراحت کے ساتھ یہ مذکور ہے کہ ناسخ نے شاعری میں ایک نیا انداز پیدا کیا جس میں معنی یابی، مضمونِ تازہ کی بندش اور خیال آفرینی کی جدتیں شامل تھیں۔ یہ طرزِ نو پرانی سادہ گوئی سے مختلف تھا۔ یہی اس کا نیا پن تھا۔ مصحفی غالباً پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے ناسخ کی شاعرانہ اہمیت کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے صراحت کے ساتھ "تلاشِ معنی ہائے تازہ" کا ذکر کیا ہے (ریاض الفصحا)۔ دیباچۂ دیوانِ ششم میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ اس کو لکھا ہے کہ ناسخ نے سادہ گوئی پر خطِ نسخ کھینچ دیا:

"حصۂ الوانِ این خوان بشیخ ناسخ... بقسوم گشت۔ تخلصِ خود را اسم با مسمیٰ انگاشتہ"

برطرزِ ریختہ گویانِ سادہ کلام در عرصۂ قلیل خطِ نسخ کشید... عاصی ہم از گروہِ سادہ گویان بود...... غزلیاتِ این دیوانِ ششم را اکثری بروتیرۂ ایشان گفتہ۔"

(معارف ۔ جلد ۴۰)

یہ عبارت ۱۲۲۴ھ میں لکھی گئی تھی ۔ گویا اس زمانے میں ناسخ کی شاعرانہ شہرت و اہمیت عروج پر پہنچ چکی تھی ۔ مصحفی نے ناسخ کے نئے انداز کا ذکر کیا ہے ۔ اس میں اصلاحِ زبان کا مطلق ذکر نہیں ۔ نہ قواعد و ضوابط کی ترتیب و تدوین کا تذکرہ ہے ۔ یہ مسلّم ہے کہ نئے اسلوب کے لیے، نئی زبان شرط نہیں ۔

مصحفی کے علاوہ اس زمانے کے دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی (جو میری نظر سے گزرے ہیں)، اصلاحِ زبان یا قواعدِ شاعری کی ترتیب کا ذکر نہیں کیا ۔ شیفتہ، احمد حسین، سحر، محسن، کریم الدین کے تذکروں کا یہی حال ہے ۔ موخر تذکروں میں سب سے اہم کتاب آبِ حیات ہے ۔ آزاد نے مختلف ادوار کے تغیرات کا ذکر کیا ہے، بہت سی مثالیں بھی دیتے گئے ہیں، لیکن ناسخ کے مفصل تذکرے میں کہیں بھی صراحت کے ساتھ یہ نہیں لکھتے کہ ناسخ نے فلاں قاعدہ بنایا یا فلاں اصلاح کی ۔ ہاں وہ کہتے ہیں کہ اسی زمانے سے دہلی و لکھنؤ کے لسانی امتیازات نمایاں ہونا شروع ہوئے، اور یہ سچ ہے ۔ اس کے برخلاف آزاد کی تحریر سے یہ البتہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نئی نئی پابندیوں کے اصل واضع ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک تھے ۔ ناسخ کے تذکرے میں انھوں نے لکھا ہے:

"ان لوگوں نے اور ان کے بعض ہم عصروں نے زبان کے باب میں اکثر تبدیلیں واجب سمجھیں کہ دلّی کے مستند لوگوں نے بھی ان میں سے بعض بعض باتوں کی رعایت اختیار کی ۔ اور بعض میں اختلاف کرتے تھے ۔ اور عام لوگ خیال بھی نہ کرتے تھے ۔ مگر اصل واضع ان قوانین کے میر علی اوسط رشک تھے ۔ چناں چہ کچھ الفاظ نمونے کے طور پر لکھنے ضرور ہیں ۔ مثلاً فرماتے تھے کہ یہاں وہاں بر وزنِ

جاں نہ ہوں۔ برونِ جہاں ہوں۔ لیکن تعجب ہے کہ شیخ صاحب اور خواجہ صاحب کوئی اس کے پابند نہ تھے [آبِ حیات۔ طبع ۱۸۹۷ء۔ ص ۲۹۵]

آخری جملے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ صورتِ حال کیا تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ متاخرین کے یہاں قواعدِ شاعری اور متروکات کی جو طویل بحثیں ملتی ہیں، وہ رشک کے آخری عہد کی پیداوار ہیں۔ ناسخ و آتش سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔ رشک آخرِ عمر میں کربلائے معلا چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۲۸۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ لیکن ان کا تیسرا دیوان جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اُن متروکات سے پاک ہے جو ان کے پہلے دو دیوانوں میں پائے جاتے ہیں، ۱۲۶۷ھ میں یعنی وفاتِ ناسخ کے کم و بیش تیرہ سال بعد مرتب ہوا ہے (کلیاتِ منیر۔ ص ۵۹۴) اور تیرہ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ آزاد نے یہاں وہاں کے متعلق جو قول نقل کیا ہے، اس کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ یہ کس کا قول ہے۔ لیکن فحوائے عبارت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قائل سے مراد رشک ہیں۔ آزاد کا ماخذ کلبِ حسین خاں نادر کی کتاب تلخیصِ معلیٰ ہے۔ لیکن نادر نے یہاں وہاں کے ذیل میں صراحت کے ساتھ یہ نہیں لکھا کہ یہ رشک کا قول ہے۔

ناسخ کی ایسی کوئی تحریر اب تک سامنے نہیں آئی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ انھوں نے قواعدِ شاعری کے سلسلے میں کیا نئی پابندیاں عائد کیں، یا متروکات میں کیا اضافے کیے۔ یعنی حاتم نے دیوان زادہ کے دیباچے میں متروکات کی جو فہرست درج کی ہے اور جس میں یاں، واں بھی شامل ہیں۔ پھر مصحفی اور انشا کے زمانے میں جو متروکات از خود شاملِ ارتقائے زبان ہوتے گئے، اُن پر کیا مزید اضافے کیے۔

عہدِ ناسخ کی کوئی دوسری تحریر بھی ایسی نہیں ملتی جس میں اصلاحاتِ ناسخ کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو۔ ناسخ کے معروف شاگردوں میں سے بحر کا رسالہ۔ بحر البیان موجود ہے، جس میں انھوں نے "چند قوانینِ ہندی یعنی اُردوی لکھنؤ" لکھے ہیں۔

اور رشک کے لغت نفس اللغۃ کا ابتدائی حصّہ (حرف ت تک) شائع ہو چکا ہے ان میں بھی ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی

اس سلسلے کے مصنفین میں یعنی تلامذۂ ناسخ میں صرف ایک کلب حسین خاں نادر ایسے شخص ہیں جنھوں نے قواعدِ زبان، قواعدِ شاعری، متروکات اور تذکیر و تانیث کی بحث پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ یہ کتاب ۱۲۸۰ھ میں مرتب ہوئی ہے یعنی ناسخ کے انتقال کے کم و بیش ۲۶ سال بعد۔ نادر نے صراحت کے ساتھ کہیں یہ نہیں لکھا کہ فلاں قاعدہ ناسخ کا بنایا ہوا ہے۔ انھوں نے ایک عام بات لکھی ہے کہ ناسخ نے سارے حشو و زوائد سے زبان کو پاک کیا۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ اس ذیل میں جن متروکات کو درج کیا ہے، وہ یا تو پچھلی اصلاحیں ہیں۔ یعنی وہ اصلاحیں جو ناسخ کے آغازِ شاعری ہی کے زمانے میں یا اُن سے بھی پہلے رائج ہو چکی تھیں یا کم از کم ان کا ذکر آچکا تھا۔ شاہ حاتم کے دیباچۂ دیوان زادہ میں (جس کا ضروری حصّہ آبِ حیات میں بھی منقول ہے) اور انشا کی دریائے لطافت میں ان میں سے بیشتر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یا پھر وہ قاعدے ہیں جن کو بعد میں فروغ ہوا۔ ناسخ کے نام کی صراحت کے برخلاف، کئی جگہ رشک کے نام کی صراحت ضرور ملتی ہے کہ اس لفظ کو میر صاحب (رشک) نے ترک کیا ہے، یا یہ کہ یہ سقم ان کے آخری دیوان میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے بھی صورتِ حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ نادر نے جن متروکات و قواعد کو ۱۲۸۰ھ میں اپنی کتاب میں درج کیا ہے، اور اس طرح درج کیا ہے جیسے یہ سب یا ان میں سے اکثر عہدِ ناسخ سے متروک یا مستعمل ہیں، ان میں سے بہت سے متروکات تلامذۂ ناسخ کے یہاں برابر ملتے ہیں۔ اوروں کا کیا ذکر خود رشک

کے مطبوعہ دواوین میں بعض باتیں موجود ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ رشک کا تیسرا غیر مطبوعہ دیوان ایسے معائب سے پاک ہے۔ تو اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ جن اصلاحوں کو نادرؔ نے فرموداتِ ناسخؔ یا مختاراتِ ناسخؔ فرض کیا ہے۔ وہ دراصل رشک کے آخری زمانے کے مختارات ہیں۔ یہی زمانہ نادرؔ کی اس کتاب کی تالیف کا ہے۔ اور یہ بھی کہ رشک کے مختارات کو ناسخؔ کے سب شاگردوں نے قبول نہیں کیا تھا۔ میرا کہنا بھی یہی ہے کہ متروکات اور قواعدِ شاعری کی نئی نئی پابندیوں کا اصل زمانہ وہ ہے جب امیرؔ و جلالؔ وغیرہ کی معرکہ آرائیوں کا دور تھا۔ خاص طور سے وہ زمانہ جب دربارِ رام پور میں کئی معروف اساتذہ جمع ہو گئے تھے اور دہلی و لکھنؤ کی ادبی چشمک ایک بار پھر چمک اٹھی تھی۔ اسی زمانے میں نئے نئے متروکات اور نئی نئی پابندیوں کا مذاق زیادہ بڑھا۔ ہاں یہ کہنا حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا کہ اس کا آغاز رشک کے دورِ آخر سے ہوا۔ ہر صورت میں ناسخؔ کا دامن اس سے پاک ہی رہے گا۔ ناسخؔ کے انتقال کے بعد ۲۶ سال کے اندر بہت سی تبدیلیاں ہوئیں لیکن نادرؔ نے ان سب کو اپنی کتاب میں اس طرح جمع کر دیا ہے کہ ان سب کا سلسلہ ناسخؔ کی مفروضہ اصلاحِ زبان کی تحریک سے جا ملتا ہے اور یہیں سے غلط فہمی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

نادرؔ نے تلخیصِ معلّی میں ناسخؔ کے بارے میں لکھا ہے:

> ہمارے استادِ صافی نہاد... نقادِ مضامینِ نو و کہن.... بانیِ طرزِ جدید و واضعِ قواعدِ جدید.... جناب شیخ امام بخش متخلص بناسخؔ علیہ الرحمۃ نے.... اپنے عہدِ فصاحت عہد میں ان سب لغویات و حشویات کو دور کر کے، ایسی صحتِ محاورات اور صفائیِ بندش اور شگفتگیِ زبان اور روزمرہ کی پیدا کی کہ سخنورانِ بلند پایہ نے... بدل پسند کیا۔
>
> بعد وفاتِ جنابِ مغفور، چند شخص شاگردانِ رشید ایسے نامور ہوئے کہ سب نے

اُن کو مانا اور اہلِ کمال سے جانا۔ ازانجملہ سید علی اوسط صاحب رشک سلمہ اللہ اور خواجہ وزیر مرحوم اور مرزا محمد رضا برق مغفور اور شیخ امداد حسین بحر، کہ ہر ایک ان میں سخنورِ یگانہ..... سید علی اوسط صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بڑے صاحب تدقیق و اہلِ استعدادِ باتحقیق ہیں کہ مثل ونظیر اپنا نہیں رکھتے، چند قواعد اور اصول اور قیود اختراع کیے، کہ اکثر قابلِ قبول اور پسندِ اہلِ سخن ہیں اور بہت سے لوگ اور کُل پیرودان کے، انھی قیود کے ساتھ شعر موزوں کرتے ہیں۔" [تلخیصِ معلّٰی ص ۲۶ تا ۲۸]

سخن گسترانہ باتوں کو الگ کر دیا جائے تو اس سے بھی اسی قول کی تکرار اور وضاحت ہوتی ہے کہ قواعد و اصول و قیود کو وضع کرنے والے رشک تھے۔ عقیدت مند شاگرد کی طرح کہا یہی گیا کہ یہ سب عطیہء استاد ہے لیکن اس کی حیثیت سلسلۂ نسب درست کرنے کی تھی۔ اس پورے گروہ میں ناسخ کی شخصیت سب سے بلند بالا تھی۔ استادِ اوّل بھی وہی تھے، واضعِ طرزِ جدید بھی وہی تھے، اس بنا پر اُن سے انتساب پاکر بات میں جو رنگِ استناد پیدا ہو سکتا تھا، وہ کسی اور طرح پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ نادر نے کئی جگہ یہ لکھا ہے کہ فلاں لفظ کو رشک نے ترک کیا ہے۔ یا یہ کہ ان کے پہلے دوسرے دیوان میں تو یہ عیب پایا جاتا ہے لیکن تیسرا دیوان اِس سقم سے خالی ہے۔ مثلاً لفظِ تلک کو نادر نے متروک بتایا ہے لیکن یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ: "یہ بھی میر صاحب کے متروکات سے ہے" (ص ۱۳)

یا لکھتے ہیں: "ازانجملہ ہے سقوط الفِ آخرِ الفاظِ عربی و فارسی و ہندی کا، کہ محض ناجائز ہے میر صاحب کا دیوانِ سیوم اس سے خالی ہے۔ پہلے اور دوسرے دیوان میں جابجا یہ بات پائی جاتی ہے۔" (ص ۴۲) اس سے تو نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نادر نے جو کچھ لکھا ہے وہ عموماً عہدِ ناسخ کے بعد کی باتوں پر مبنی اور مشتمل ہے۔ اگر عہدِ ناسخ میں یہ سب کچھ ہو چکا ہوتا تو پھر دواوینِ رشک میں ان کا وجود نہیں ہو سکتا تھا۔

آخرِ عمر میں اگر رشک نے کچھ ضابطے بنائے یا پابندیاں لازم قرار دیں تو اس کا اثر عہدِ جلال پر تو پڑ سکتا ہے، جو متروکات وقواعد کی فضول بحثوں کا حقیقی زمانہ ہے، ناسخ کے عہد سے اس کا کیا تعلق:

یہ بات کہ رشک نے آخر عمر میں متروکات کی طرف زیادہ توجہ کی تھی، نادر کے بیانات کے علاوہ، شوق نیموی نے بھی بیانِ متروکات کے ذیل میں اس کی صراحت کی ہے:

"خصوصاً میر علی اوسط رشک مرحوم نے بہت سے الفاظ متروک کیے، جن سے اُن کا تیسرا دیوان، جو اب تک چھپا نہیں ہے، پاک ہے۔ متروکات کے باب میں اکثر لوگ رشک مرحوم کے مقلد ہیں۔ اس رسالے میں اکثر انھی کے متروکات ہیں۔"

(حاشیہ رسالۂ اصلاح۔ مطبوعہ ۱۸۹۳ء ص ۱۱)

اس تحریر میں اس کی تو گنجایش نہیں کہ اہم تلامذۂ ناسخ مثلاً رشک، بحر، وزیر وغیرہ کے کلام کا بہ لحاظِ متروکات و پابندیِ قواعدِ شاعری مکمل یا مفصل جائزہ پیش کیا جائے، لیکن محض اظہارِ واقعہ کے طور پر رشک، بحر اور وزیر کے دواوین سے صرف چند مثالیں اُن امور کی پیش کی جاتی ہیں جن کو نادر نے تلخیصِ معلیٰ میں متروک قرار دیا ہے۔ اس سے صورتِ حال کا کچھ نہ کچھ اندازہ کیا ہی جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر سب کچھ ناسخ کر چکے تھے، تو ان کے تلامذہ کے یہاں ان کو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ رشک، بحر اور وزیر کے دواوین وفاتِ ناسخ کے بعد چھپے ہیں۔

لیکن ان مثالوں کو پیش کرنے سے پہلے، تذکیر و تانیث کے سلسلے میں نادر کی ایک عبارت نقل کرنا چاہتا ہوں، جس میں انھوں نے صاف طور پر (اور یہ محض حُسنِ اتفاق ہے) لکھا ہے کہ ناسخ نے تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ نہیں بنایا تھا!

"جاننا چاہیے کہ الفاظِ ہندی کی تذکیر و تانیث کے لیے کچھ اصول اور قواعد ہمارے دیکھنے میں نہیں آئے۔ جناب استادِ مغفور سے جو کئی برس مشرفِ حضوری رہ کر پوچھا گیا تو یہی فرمایا کہ کچھ قواعد منضبط نہیں۔ جس طرح پر خواص شعرا اور فصحائے اہلِ شہر کی زبانوں پر جاری ہو، ویسا ہی بولنا چاہیے" (تلخیصِ معلّٰی ص ۴۵)

ناسخ کے ایک شاگرد کے اس واضح بیان کے بعد، اب صاحبِ شعرالہند کی یہ عبارت دیکھیے جو انھوں نے ناسخ کی اصلاحات کے ذیل میں لکھی ہے۔ ناسخ کی ساتویں اصلاح کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"اب تک فارسی، عربی اور ہندی زبان کے جو الفاظ مستعمل تھے ان کی تانیث و تذکیر کا کوئی قاعدہ مقرر نہ تھا۔ لیکن ناسخ نے ان الفاظ کی تذکیر و تانیث کے قاعدے بنائے"

(شعرالہند۔ طبع چہارم۔ ص ۱۹۱)

اس سے قیاس کرنا چاہیے کہ مفروضات کا مال کیا ہے۔ ہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ سید انشا تذکیر و تانیث کی بحث کو دریائے لطافت میں چھیڑ چکے تھے۔ تلخیصِ معلّٰی کا سالِ ترتیب ۱۲۸۰ھ (۶۴-۱۸۶۳ء) ہے اور دریائے لطافت کا سالِ تصنیف ۱۲۲۲ھ (۸-۱۸۰۷ء) ہے۔ تذکیر و تانیث کا مسئلہ بھی متاخرین میں خاصا معرکہ آرا رہا ہے۔ لیکن یہ معرکہ آرائی یا معرکہ آفرینی ہے عہدِ ناسخ کے بعد کی۔ اگرچہ تذکیر و تانیث کے بعض اختلافات اُس زمانے میں نظر آ جاتے ہیں لیکن ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایسے اختلافات ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عہدِ ناسخ میں اور ان کے بعد بھی دنوں تک تذکیر و تانیث سیال حالت میں رہی ہے۔ خود ناسخ اور ان کے بعض تلامذہ کے یہاں یکسانیت نہیں ملتی۔ اچھے خاصے اختلافات ہیں۔

بات میں بات نکل آئی۔ ایک اور دل چسپ اندراج دیکھیے۔ صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر میں اصلاحاتِ ناسخ کے ذیل میں ناسخ کے اِن دو کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے،

"اوّل۔ زبانِ اُردو کو ریختہ کہتے تھے اور اطلاق اس کا کبھی فقط نظم پر ہوتا تھا اور کبھی زبان پر۔ ناسخ کے وقت سے اس کا نام اُردو مقرر ہوا۔ اور ریختے کا لفظ اڑ گیا۔ مگر دہلی میں غدر کے بعد تک رہا۔"

"دوم۔ غزل کو لوگ ریختہ کہتے تھے۔ ناسخ نے غزل کا لفظ جاری کیا اور ریختے کا لفظ ہر معنی کے لیے متروک کیا۔" (جلوۂ خضر۔ جلدِ دوم)

اِس بیان کے بعد اب ناسخ کے اس شعر کو پڑھیے جو اُن کے دوسرے دیوان میں ہے:

سب زمینیں ہیں نئی، بیتیں ہیں اے یار نئی
روز یاں ریختے کی اٹھتی ہے دیوار نئی (ص ۲۴۴)

صاحبِ شعر الہند نے بھی اس شعر کو اس قول کے حاشیے میں نقل کیا ہے۔ نور اللغات میں بھی لفظِ ریختہ کے ذیل میں یہ شعر نقل کیا گیا ہے۔ اس طرح کے بیانات سے اُس مفروضہ پرستی کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو ناسخ کے سلسلے میں بعد والوں نے اختیار کر لی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دہلی میں غدر کے بعد تک لفظِ ریختہ مستعمل رہا۔ لیکن وہ لوگ غزل کا لفظ بھی اسی طرح استعمال کیا کرتے تھے۔

ہاں، تو ذیل میں ان تین معروف تلامذۂ ناسخ کے دواوین سے دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں ان متروکات کی، جن کو نادر نے خلافِ فصاحت قرار دیا ہے اور جن کے متعلق گویا یہ کہا گیا ہے کہ ناسخ نے یا کم از کم رشک نے تو لازماً ان کو ترک کر دیا تھا۔

لفظ اوپر بجائے پر کے لیے نادر نے لکھا ہے کہ یہ متروک ہے۔ بحر کے دیوان ریاض البحر میں ردیف ر میں ایک غزل ہے، جس کی ردیف اوپر ہے۔ مطلع یہ ہے:

قربان مہ و مہر ہیں رخسار کے اوپر کیا نور کا عالم ہے مرے یار کے اوپر (ص ۹۶)

یہ پندرہ اشعار کی غزل ہے۔

رکھا بہ تخفیف (بروزنِ رہا) کو نادر نے دو جگہ متروک لکھا ہے اور اس پر

بہت اصرار کیا ہے۔ اسی طرح بل بے، واں، تمر بہ فتحِ اول (بغیرِ ترکیبِ فارسی)، ان سب کو متروکات میں شامل کیا ہے:

پھول وہ لاغر جب رکھا اُن کے کفِ رنگیں پہ ہاتھ	وزیر	(دفترِ فصاحت ص ۲۷)
بل بے شوخی، دیکھتے ہیں جب مراقدِ دوتا	"	(" ")
واں بھی جا پہنچے خریدارانِ حُسنِ خود فروش	"	(" " ص ۲۶)
ہمارے تیغ کا سایہ پڑا مرے تمر پر	"	(" " ص ۱۰۳)

ردیف و قافیہ ہے: لاغر پر، بستر پر۔ یہ سب لفظ (اور بہ قولِ نادرؔ متروکات) کلامِ ناسخؔ میں بھی موجود ہیں۔ فارسی عربی لفظوں کے آخر سے حروفِ علت کے سقوط کو نادرؔ نے من جملۂ معائب قرار دیا ہے۔ اسی طرح جن لفظوں کے آخر میں نون ہو اور وہ از قسمِ خون، دین، جان وغیرہ نہ ہوں، جن کو عموماً بہ اعلانِ نون استعمال کیا جاتا ہے، تو جب یہ لفظ مرکب نہ ہوں، اُس وقت بھی ان میں اخفائے نون کو ضروری قرار دیا ہے۔ صرف چند لفظ اس قاعدے سے مستثنا قرار دیے گئے۔ غیر مستثنا لفظوں کی مثالیں اور فارسی عربی لفظوں میں سقوطِ حرفِ علت کی صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

شامِ زلف افشاں سے کب وہ سحر کرتے نہیں	رشکؔ	(مجموعۂ دو دواوینِ رشک ص ۲۷)
بلایا غیر کو گھر میں، ہمیں زنداں میں بھیجا	"	(" " " ص ۲۸۸)
یعنی بزمِ عاشقاں میں بار پایا چاہیے	"	(" " " ص ۳۵۳)
یعنی جو ذلت ہوئی، عزت ہوئی	"	(" " " ص ۳۶۶)
حنائی ہاتھ میں گیسو کو لے کے بولا یار	وزیرؔ	(ص ۵۰)
اب تو رہائی ناخنِ خنجر کے ہاتھ ہے	"	(ص ۶۷)
دلجوئی فقیروں کی ہے خوشنودیِ معبود	بحرؔ	(ص ۲)

اعلانِ نون کا یہ انداز اور سقوطِ حروفِ علّت، کلامِ ناسخ میں عام ہیں۔
اضافتِ مہنّد کو نادر نے سختی کے ساتھ معیوب لکھا ہے۔ صرف رشک کے یہاں سے اس کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

گویا بنایا نادِ دُخانی بخار نے (ص ۳۴۹)
نہیں قاتل کی کٹاری میں کوئی بیلِ ترنج (ص ۳۵۴)
کثرتِ بہتاں سے نادِ غم طوفانی ہوئی (ص ۳۶۹)

ایسے مہنّد مرکّبات جو عطف و اضافت کے سوا دو طریقوں سے مرکب ہوں:

جب کبھی ڈھب پر چڑھا انداز بے ڈھب ہوگیا (ص ۷۳)
بے ڈھنگیاں کلام میں ہیں ڈھنگ کے عوض (ص ۱۵۳)
کس قدر معشوق پن ہے رات بھر کے چاند میں (ص ۱۹۳)
چاہوں جو زندگی وہ جگت آشنا نہیں (ص ۲۱۲)
ربط بے ڈول بڑھا کاہشِ غم سے ہم کو (ص ۲۴۵)

فارسی والوں کی تقلید میں عربی لفظوں کی ایک خاص مفرّس صورت:

سادگی سے سبزۂ رخسار انسب ہوگیا گیا مزلّف ہوتے ہی چہرہ مرتّب ہوگیا
ص ۴

نادر نے جن لفظوں کو شاملِ فہرستِ متروکات نہیں کیا ہے۔ لیکن اور لوگوں نے ان کو متروک قرار دیا ہے اور اب وہ فہرستِ متروکات میں لازماً شامل کیے جاتے ہیں، ایسے الفاظ میں سے محض بہ طورِ مثال صرف ایک لفظ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ سمیت بہ معنی ساتھ کو واجب الترک الفاظ میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ رشک کے یہاں موجود ہے:

تغیرِ سمیت مجھ کو قرآں آیا (ص ۲۹۲)

ص ۱۰۱ پر ایک غزل ہے جس کی ردیف سمیت ہے۔

یہ بات کہ رشک نے جو کچھ کہا ہو، وہ جملہ شاگردانِ ناسخ کا مسلّمہ ہو، ایسا بھی نہیں۔ ایک مثال سے اس کا بھی بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لفظِ تلک کے متعلق نادر نے لکھا ہے کہ یہ رشک کے متروکات میں سے ہے۔ لیکن ناسخ کے دوسرے شاگرد بحر نے اپنے رسالے بحرالبیان میں، جس میں انھوں نے بہ قولِ خود "اُردوے لکھنؤ" کے قواعد لکھے ہیں، دونوں لفظوں کو مستعمل بتایا ہے: تک و تلک، بفتحتین، ہردو برای انتہا[1] لفظِ سمیت بھی اس میں موجود ہے۔

یہ تو شاگردانِ ناسخ کا حال تھا۔ میں اتمامِ سخن کے طور پر آتش کے ایک معروف شاگرد میر وزیر علی صبا کے دیوان غنچۂ آرزو سے ایسے چند متروکات کی مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو آج فہرستِ متروکات میں ملتے ہیں۔ یہ عرض کر دیا جائے کہ یہ سب کلامِ آتش میں بھی موجود ہیں۔ یہ بھی ظاہر کر دیا جائے کہ صبا کا انتقال ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں ہوا تھا، یعنی ناسخ و آتش دونوں کے بعد۔

سدا	گرداب سے کیوں کرنہ کرے آب سدا رقص	ص ۶۹
"	ہر حال میں خوش رہتے ہیں کرتے ہیں سدا رقص	"
رکھا	سدا خراب رکھا اپنے ساتھ اس کو بھی	ص ۵۰
انکھڑیاں	وہ لال لال نشیلی جو انکھڑیاں دیکھیں	ص ۹۶
سقوطِ ی	خود بینی کا رواج کبھی پیش تر نہ تھا	ص ۲۴
دکھلانا	اے جنوں جذب کا عالم جو کبھی دکھلائیں	ص ۲

[1] اس کا واحد مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ میں نے اس رسالے کو اُردو ادب کے شمارہ ۱ بابت ۱۹۶۲ء میں شائع کرا دیا ہے۔

دکھلانا　　دکھلایا ناتوانی نے گھر یار کا مجھے　　ص ۱۶۱

روزِ حشر کو　　رُتبہ مرے جنوں کا کھلا روزِ حشر کو　　ص ۳۶

سر بہ فتحِ اول　　دنیائے بدنہاد کا سودا ہے سر کے ساتھ　　ص ۱۲۴

قافیے : اثر، گھر وغیرہ۔ بات ذرا دراز ہوگئی، لیکن ان مثالوں سے یہ ضرور واضح ہوگیا ہوگا کہ جہاں تک قواعدِ شاعری کی پابندیوں کا اور متروکات کا تعلق ہے، ان کی جو فہرستیں آج ہمارے سامنے ہیں، یا جن کو ناسخ سے یا عہدِ ناسخ سے منسوب کیا جاتا ہے، حقیقت میں عہدِ ناسخ سے ان کا تعلق نہیں۔ یہ سب یا ان میں سے اکثر و بیش تر بعد والوں کے کارنامے ہیں جو بہ تدریج مرتب ہوتے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ جلال وغیرہ کے زمانے میں دفتر تیار ہوگئے۔

دوسرا حتمی ثبوت اس بات کا یہ ہے کہ نادر نے اپنی کتاب میں جو متروکات درج کیے ہیں اور جن کے ذیل میں یہ لکھا ہے کہ ہمارے استادِ صافی نہاد نے ان سب حشویات و لغویات کو دور کر دیا، قریب قریب وہ سب کلامِ ناسخ میں موجود ہیں۔ شروع ہی کے کلام میں نہیں، آخر کے کلام میں بھی۔ اگر خود ناسخ نے وہ سارے قاعدے بنائے ہوتے جن کو نادر نے درجِ کتاب کیا ہے، تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ خود اُن کے کلام میں ان کی پابندی نہ ہو۔ یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ جن باتوں کو صراحت کے ساتھ رشک سے منسوب کیا گیا ہے، ان کے متعلق بھی یہ مسلّم ہے کہ وہ فرمودۂ ناسخ نہیں تھیں، رشک کے اپنے اختراعات تھے۔ کیوں کہ اگر ناسخ نے یہ ہدایتیں جاری کی ہوتیں، تو خواہ رشک نے ان کا اعلان کیا ہوتا، لیکن ہر صورت میں ناسخ کا کلام ان سے بھی محفوظ ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض جزوی اختلافات سے قطعِ نظر کر کے دیکھا جائے تو متروکات اور قواعدِ شاعری کے لحاظ سے ناسخ و آتش کی زبان کی عام سطح وہی ہے

جو دوسرے شعرا کی تھی۔ چوں کہ اصلاحِ زبان کا انتساب ناسخ سے اس زور شور کے ساتھ کیا گیا ہے کہ آج آسانی کے ساتھ اس کا انکار مشکل ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ ناسخ سے ایسی کچھ مثالیں پیش کی جائیں، جن سے قطعی طور پر یہ ثابت کیا جا سکے کہ ناسخ کے کلام میں ایسی بیش تر باتیں بکھری ہوئی ہیں، جن کو بعد والوں نے متروکات یا معائب میں شمار کیا ہے۔ اور یہ کہ دو چار باتوں کو چھوڑ کر (جن کی تفصیل آگے چل کر پیش کی جائے گی) متروکات و قواعد کے لحاظ سے ناسخ کی شاعرانہ زبان وہی ہے جو دہلوی شعرا یعنی ذوق، غالب اور مومن وغیرہ کی تھی۔

قواعدِ شاعری میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے کہ عربی فارسی لفظوں کے آخر سے حرفِ علت خاص طور سے یائے معروف کو ساقط نہیں ہونا چاہیے۔ ہندی لفظوں کے آخر سے الف کا ساقط ہونا بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ہندی لفظوں کے آخر سے بھی حرفِ علت کو اس طرح ساقط نہیں ہونا چاہیے کہ روانیِ کلام پر اس کا اثر پڑے۔ پہلے قاعدے کو نادر نے تلخیصِ معلیٰ میں (ص ۲۰) اس طرح لکھا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی فرمودۂ ناسخ ہوگا۔ دوسرے قاعدے کو (الف کا سقوط) نادر نے صراحت کے ساتھ رشک سے منسوب کیا ہے (ص ۳۲) لیکن مولانا نظم طباطبائی نے اور اُن کی تقلید میں مولانا حسرت موہانی نے ان تینوں قاعدوں کے مجموعے کو ناسخ سے منسوب کیا ہے۔ مولانا حسرت نے اپنے رسالے معائبِ سخن میں لکھا ہے:

"اُردو زبان میں حرفِ علت یعنی واو، الف، ی کا گرنا یا دب کر نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شیخ ناسخ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے تلامذہ کو اخیر زمانے میں جو ہدایتیں کی تھیں، اُن میں سے ایک یہ بھی تھی .... مگر بہ قولِ مولوی حیدر علی[1] (کذا)

---

[1] "رسالہ اُردوئے معلیٰ"، علی گڑھ، بابت جولائی ۱۹۰۸ء ص ۱۵۔

نظم طباطبائی ، شیخ کی اس وصیت پر کسی سے عمل نہ ہو سکا ..... شیخ کا متنبہ کرنا اس بنا پر تھا کہ فارسی میں ایسا کہیں نہیں دیکھا گیا کہ میکنی و میروی میں سے یٖ کو گرادیں یا ....." (طبع چہارم ص ۱۷)

ناسخ و آتش دونوں کے کلام میں فارسی و عربی الفاظ کے آخر سے یاے معروف کا سقوط عام ہے ۔ دہلوی شعرا کے کلام کی بھی یہی حالت ہے ۔ یہاں ناسخ کے دیوانِ دوم سے (جس میں تیسرا دیوان بھی شامل ہے) سقوط کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ناسخ سے جس وصیت کو منسوب کیا گیا ہے اور نادر نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے ، اُس کو ناسخ سے کچھ نسبت نہیں ۔ دیوانِ اوّل سے قصداً مثالیں نہیں لی گئیں ، محض اس خیال سے کہ شاید یہ کہا جائے کہ یہ دورِ اوّل کے کلام پر مشتمل ہے [اگرچہ یہ خیال بھی صحیح نہیں ہوگا ۔ پہلا دیوان ، جس کا تاریخی نام دیوانِ ناسخ ہے ، ۱۲۳۲ھ میں مرتب ہوا ہے جب کہ ۲۴ ھ میں ناسخ شہرت کی بلندی پر پہنچ چکے تھے ۔] دیوانِ اوّل سے اگر کہیں مثال نقل کی جائے گی ، تو اس کی صراحت کر دی جائے گی ۔

آج اے جانِ خود آرائی کا سامان کرو — ص ۲۰۸

ہیں یہ بے تابی کے مضموں کہ کسی رنگ کا ہو

نامے کے بندھتے ہی سیمابی کبوتر ہو جائے — ۲۶۷

کہیں الٰہی مری آہ کو اثر مل جائے — ۲۸۲

جو چُھٹتے ہیں پیشانی پر آپ افشاں — ۲۸۸

دے لے کسی کو قابو جو انسان کا چلے — ۲۸۹

خونخواری کی عادت جو ہے اے یار نہ چھوٹی — ۳۰۷

خالی رہنا گھر کا ہوتا ہے بُرا — ۳۰۸

پیری میں دونا جوانی سے جنوں کا زور ہے — ۳۱۱

کیا ہو بغیرِ پستی کے آبِ رواں بلند ١٠٥

کام خونریزی ہے اس یوسفِ بازاری کا ١١

کہ نہریں جاری ہوئیں موسم بہار آیا ۵

چھوڑوں کیا پیری میں شیریں دہنوں کی صحبت ٢٦

چین عریانی کا کفن میں نہیں ١۴۵

ان مثالوں کی کیفیت "مشتی نمونہ از خرواری" کی ہے۔ ہندی لفظوں میں نادر ونظم نے جس صورت میں سقوطِ حروفِ علت کو ممنوع لکھا ہے، اس کی بھی ہر طرح کی بے شمار مثالیں کلیاتِ ناسخ سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہاں پر ایسی چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

جھوٹا پانی یار کا تھوڑا پلا دے اے طبیب ص ١١٣

ہو جیسے کشتیِ کاغذ خراب دریا میں ١۴٨

مُردوں کی صورت رہوں اب تا قیامت خواب میں ١۴٩

ضرور اس کو پہنچایا میرا اسلام ٣٧٣

مرا دادا ہاشم ہے سُن مجھ سے صاف ٣٧٢

آپس میں ہے حسینوں کو بھی رشک کس قدر ١٩٠

ہیں اُن کے روضوں کو بھی گنبدیاں درکار سونے کی ٣٢٠

شکل دیکھی ہو اے ہمدم گر کبھی آرام کی ٣٢١

رشکِ ساقِ عرق ہے دروازے کا بازو مجھے ٢٨۴

غنائے قلقلِ مینا سے آیا حال مجھے ٢٣٦

دہلوی شعرا کے کلام میں بھی حروفِ علت کے سقوط کا بالکل یہی حال ہے۔

اگر کے مخفف گر کو نادر نے متروک بتایا ہے۔ لکھتے ہیں: "ازانجملہ ہے لفظِ دو حرفی گر کا، کہ حروفِ شرط سے ہے۔ بے الف ناجائز کیا گیا ہے" (ص ٣۴)۔ ناسخ کے یہاں اس کا

استعمال عام ہے۔ مثلاً:

لطف کیا گر ہوئی گوروں کی طرح کھال سفید ص ۹۸

رات کو گر چاندنی تو دن کو ترساتی ہے دھوپ ۸۰

پونچھوں گر دیدۂ گریاں تو ہو رومال سیاہ ۲۲۰

یاد کرے خوب قاصد گر مرے پیغام کو ۲۱۰

گر نہ ہو سیماب کب ٹھہرے نظر میں آئنہ ۲۲۲

وہ سیہ بخت ہوں، گر سایہ فگن ہو مجھ پر ۲۲۰

بل بے، مت، بن، اور بروزن فع کو بھی نادر نے متروکات کے ذیل میں شامل کیا ہے

طالبِ حق ہے اگر، مت سالکوں کا ساتھ چھوڑ ص ۱۸۲

ہمارے مزرعِ امید کا کچھ حال مت پوچھو ۲۶۲

سر جس جگہ قلم ہوں، اور جسم کے ہوں پرزے ۲۶۱

اور آیا قریبِ رسالت مآب ۳۷۰

نہ سرِ زلف ملے، بل بے درازی تیری ۲۱۴

مے کشی میں روتے روتے ہیں ہوا بن یار کور ۲

زور بمعنی عجیب و بہت اور ستو، یہ دونوں لفظ بھی آج فہرست متروکات میں ملتے ہیں:

اے فلک، زور انقلاب ہوا ص ۱۰

یہ زور ہنسی ہے کہ رلا جاتے ہو مجھ کو ص ۲۱۱

ساقیا دیر نہ کر، دیکھ تو ہے زور گھٹا ص ۶۸

ساقیا، زاہد بھی کوئی زور ہے ص ۲۶۵

اب تو ناسخ زور رندِ لا اُبالی ہو گیا ص ۴۴

زور ہے گرمیِ بازار ترے کوچے میں ۱۲۲ (دیوانِ اول)

زورِ سودا مول لیتے ہیں سرِ بازار ہم — ص ۱۲۹ (دیوانِ اول)

جو تجھ کو دیکھے تو بینا، نہ تجھ کو دیکھے تو کور — ص ۱۹۵

قالبِ بے روح تھا مینا، تو گویا ہوگیا — ۲۰۰

جو اس میں آپ کو منظور ہو، تو جھٹ پٹ ہو — ۲۱۲

تو کا استعمال کلامِ ناسخ میں بہت ملتا ہے۔ یہ دونوں لفظ اسی طرح شعرائے دہلی کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔

واں اور یاں بروزنِ جاں کو نادر نے متروک لکھا ہے:

"بحذفِ ہائے ہوز۔ یہ بھی متروکات سے ہے۔ چاہیے کہ یہاں اور وہاں موزوں ہوا کرے۔ اعلانِ ہائے ہوز ضروریات سے ہونا چاہیے۔" (ص ۴۴)

یاں اور واں ناسخ و آتش کے کلام میں ہزار جگہ مل جائیں گے۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک مصرع پر اکتفا کروں گا:

واں چھپا وہ ماہ، یاں دل پارہ پارہ ہوگیا۔ (ص ۲)

شوق نیموی نے رسالۂ اصلاح کے حواشی موسوم بہ ایضاح میں ان دونوں لفظوں کے ذیل میں صاف بات لکھ دی ہے، ان کو متروک لکھ کر لکھتے ہیں: "خصوصاً رشک کے مقلدین نے تو یک قلم ترک کر دیا ہے۔" اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یاں، واں کا قضیہ ناسخ سے نہیں، رشک سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متاخرین میں سے جو لوگ اپنے کو رشک کا مقلد نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے اس قول کی پابندی مطلق نہیں کی۔ امیر مینائی کے یہاں یہ لفظ بالعموم پائے جاتے ہیں اور خورشید لکھنوی نے رسالۂ افادات میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ میں نے یاں، واں کو ترک نہیں کیا ہے۔ شعرائے دہلی کے یہاں بھی یہ مستعمل رہے ہیں۔

معروف و مجہول کے تقفیے کو اساتذۂ متاخرین نے عیب قرار دیا ہے۔ ذوق و غالب کے عہد تک شعرائے دہلی اس میں کچھ زیادہ مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ اور ضرورۃً ایسے بعض قافیے بھی نظم کر لیا کرتے تھے۔ ناسخ کے یہاں بھی یہی صورت ملتی ہے کہ جس طرح بعض قافیے خاص خاص زمینوں میں دہلوی شعرا کے یہاں نظم ہو گئے ہیں اسی طرح ناسخ نے بھی ضرورۃً ایسے قوافی کو بے تکلف نظم کیا ہے۔ مثلاً:

ہم نمازوں میں جو تا دیر کھڑے رہتے ہیں — سامنے یہ بتِ بے پیر کھڑے رہتے ہیں

(ص ۱۶۴)

ہوئی پیشِ نبی بے شبہ عرضِ حال آہو سے — دلیل اس پر ملی ہے آپ کی چشمِ سخن گو سے

(ص ۲۸۰)

مائل سوے سجود یہ تیرے حضور ہے — سرورنہ میرا یار بہت پُر غرور ہے
مجھ کو تو یار سے ہے ہم آغوشی کا خیال — وا میرے اشتیاق میں آغوشِ گور ہے

ص ۳۱۶ (دیوانِ اوّل)

کیا اثر میری سیہ بختی کے آگے نور کا — ماہ ہے اک خال رخسارِ شبِ دیجور کا
خط سے زائل ہو گئی رخسارِ جاناں کی بہار — تھا چمن نازک، اٹھا صدمہ نہ پائے مور کا

ص ۲۱ (دیوانِ اوّل)

آئنے سے ہے دوچار اے آئنہ رو، آئنہ — میں ہوں حیرت سے، صفائے جسم سے تو آئنہ
حیرتی تیرے کسی کی بات کا کیا دے جواب — ہو گیا مانندِ طوطی کب سخن گو آئنہ

(ص ۲۲۳)

آہِ شب کا تو اثر الٹا ہے اس خورشید پر — مانگتا ہوں میں دعائے صبح کس امید پر
تیرے ابرو سے کسی مجنوں نے کیا تشبیہ دی — جوہرِ خنجر نکل آئے ہیں برگِ بید پر
جام اپنا ہے لبالب جامِ خالی اس کے پاس — مے کدے میں لے گئے ہیں فرق ہم جمشید پر

آپ اب چلنا پڑا ناسخ دیارِ یار کو　　قاصد اپنا آج تک آیا نہ اس تاکید پر

(ص ۱۱۳)

لگنے دو خاکِ کوچۂ دلدار پاؤں میں　　پاپوش کچھ نہیں مجھے درکار پاؤں میں
اس درجہ ہم نے آدمیوں سے اُٹھائے رنج　　اب زندگی کریں گے بسر چار پاؤں میں

(ص ۱۹۳)

مندرجۂ بالا مثال میں ردیف کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے، وہ قدیم دہلوی شعرا کی یاد دلاتا ہے۔ ناسخ کے یہاں ایسی توڑ مروڑ کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً:

ہے گُلِ رخسارِ جاناں، نرگسِ جادو سیاہ　　ہو گئے ہیں تابشِ خورشید سے آہو سیاہ
سُننے والے کہتے ہیں اپنے کیے کی ہے سزا　　گر کبھی کرتا ہوں میں جورِ بتِ بدخو سے آہ

(ص ۲۲۴)

کر دیے خط نے ترے عارضِ پرنور سیاہ　　ہو گیا مشک کے مانند یہ کافور سیاہ
پاس جو بیٹھ کے پڑھتے تھے غزل، وہ گئے دن　　اب تو ناسخ کبھی کر آتے ہیں ہم دور سے آہ

(ص ۲۲۴)

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ　　لکھنؤ مجھ پر فدا ہے، میں فدائے لکھنؤ

(ص ۲۰۸)

ان اشعار پر اعتراض بھی کیا جا چکا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے رسالۂ اصلاح ص ۲۸، ۲۹۔
ایک اور قافیہ دیکھیے:

آج خلوت میں مرا دل خوش ہے　　ساقیِ سیم ساقِ مہ وش ہے (۲۹۲)

فارسی میں یہ قافیہ بالکل درست ہوگا لیکن اردو میں خُوش صرف بضمِ اول مستعمل ہے۔ نادرؔ نے دَو اور جَو کے قافیے کو غلط بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: " اور جو لوگ کہ جَو کے ساتھ لفظ دَو کا قافیہ کرتے ہیں، یہ بھی نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ دَو کے آخر میں

ہاے ہوز ہے، جو کا قافیہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔" (ص ۱۲۵)
ناسخ کے یہاں یہ بھی موجود ہے:

کیا جس نے ماہِ دو ہفتہ کو دو ۔۔۔ بلائے نہ کیوں عمرِ رفتہ کو دو (۲۶۸)

ایک اور قدیم صورت دوہیں بھی ملتی ہے

تو دوہیں مارِ سیہ بن کے یارِ غار آیا (ص ۵)

ہوگیا مانندِ شانہ دوہیں افگار آئنہ (ص ۲۳۰)

شعرائے دہلی کے یہاں بھی اس قافیے اور اس لفظ کا استعمال اسی طرح ملتا ہے۔
تقابلِ ردیف کو بھی اچھا نہیں بتایا گیا ہے اور اس کو بھی من جملۂ معائب قرار دیا گیا ہے۔ (معائبِ سخن ص ۴۶) ناسخ کے یہاں یہ بھی اسی طرح موجود ہے، جس طرح دہلوی شعرا کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

نہا رہے ہیں وہ غیروں کے ساتھ گنگا میں ۔۔۔ نہائیں ہم بھی نہ کیوں آنسوؤں کی ندیا میں
اسی کی چوب کا شانہ ہو تیری زلفوں میں ۔۔۔ جو بن گیا تھا عصا سانپ دستِ موسیٰ میں

(۱۹۵)

اے پری مکھڑا ملا ہے کیا ہی پیارا چاند کو ۔۔۔ رات میں نے تیرے دھوکے میں پکارا چاند کو
جب چھپا لیتے ہو تم آئینۂ رخسار کو ۔۔۔ جوشِ بے تابی بنا دیتا ہے پارا چاند کو

(۲۱۷)

تلک کے لیے نادر نے صراحت کر دی ہے کہ یہ رشک کے متروکات میں سے ہے۔ گویا ناسخ کے یہاں یہ پایا جاتا ہے اور یہی صحیح ہے۔ مثلاً:

قہقہہ ہونٹھوں تلک پہنچا کہ نالا ہو گیا (ص ۲)

بُت کو اک مدت تلک سمجھا کیے اللہ ہے (۲۵۸)

جب تلک گردش ہے اس کو اک جہاں گردش میں ہے (دیوانِ اوّل)

گل تلک چاک قبا کرتے ہیں (دیوانِ اوّل)

رکھا (بہ تخفیف) اور پہ، پر کے مخفف کو بھی نادر نے متروک لکھا ہے۔ رکھا بغیرِ تشدید کو تو دو جگہ انھوں نے درج کیا ہے۔ ناسخ کے یہاں یہ دونوں بھی موجود ہیں۔ اول الذکر کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ، "ازانجملہ ہے لفظ رکھے کا، تخفیف کاف کی ناجائز سمجھی گئی ہے۔ چاہیے کہ کاف مشدد ہو" (ص ۲۶) لیکن یہ "ناجائز صورت"، کلامِ ناسخ میں بہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً

قدم رکھا کہیں اور جا پڑا کہیں کا کہیں ص ۱۹۱

ناتوانی نے رکھا محروم استقبال سے ۲۷۵

علی نے رکھا سر بہ روے زمیں ۲۷۰

رکھو مومنو اس طرف گوشِ جاں ۲/۸

دامن آنکھوں پہ رکھو، چاک گریبان کرو ۲۰۸

ہے نام تو اچھا پہ نگینا نہیں اچھا ۶۲

زوائد کا استعمال دہلوی شعرا کے کلام میں عام ہے۔ ان کے استعمال سے کبھی کبھی تعقیدِ لفظی اور سستیِ بندش کے عیب بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ناسخ کے کلام کا بھی یہی عالم ہے۔ ہر قسم کے زوائد ان کے یہاں کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ ان میں ایسے زوائد بھی شامل ہیں جو فارسی کے مخصوص اندازِ بیان سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اُردو میں وہ بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح بندش کی سُستی، جس سے کلام میں عدمِ روانی کا عیب، جھلک اٹھتا ہے اور تعقیدِ لفظی کی مثالیں ان کے یہاں بکھری ہوئی ہیں اور ان میں سے اکثر انھی زوائد کے استعمال کے نتیجے میں نمایاں ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے دہلوی شعرا اور ناسخ کے کلام کی سطح یکساں نظر آئے گی۔ ہر قسم کے زوائد کی کچھ

مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ آگے چل کر تعقید اور سستی بندش کی متعدد مثالوں میں بھی ان کو دیکھا جا سکتا ہے:

یہ جنازہ ہے گویا گہوارہ ہے — ص ۲۴۱
بندہ عاشق ہے گویا ایوب ہے — ۲۵۱
یہ کٹاری ہے گویا اس کی کمر میں آئنہ — ۲۲۲
گو چلے بادِ بہاری یا کہ آئے برشکال — ۱۲۳
کفِ افسوس کے ملنے کو کفن ہے ناسخ — ۱۱۷
واہ کیا رنگ ہے گویا کہ ٹپکتا ہے شہاب — ۹۸
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا — ۲۸
کوئی گویا کہ مرے آبلوں میں خار نہیں — ۱۸۷
خورشید جلوہ گر ہے و لیکن سحر نہیں — ۱۹۰

دہلوی شعرا بعض الفاظ کو اضافۂ الف کے ساتھ بے تکلف استعمال کر لیا کرتے تھے جیسے مومن کا یہ مصرع: کی ہو گی فلک نے مرے افغاں کی شکایت۔ ناسخ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا:

اس قدر مشق رہی نالہ و افغاں کی ہمیں — ۲۴۳
آج ناسخ کی طلب کو شتر اسوار چلے — ۲۶۱
اپنا آئینہ نہیں کرتا اب اسکندر پسند — ۱۰۴
یہ کس شاعر نے ناموزوں کیا مصراعِ موزوں کو — ۲۲۹ (دیوانِ اوّل)
یار کو ناسخ یہ لکھ مصراعِ استادِ قدیم — ۱۶۸ (دیوانِ اوّل)

لیکن زوائد کی سب سے بھدی صورت ان کے یہاں وہ ہے جب وہ منادا کو مصرع کے درمیان میں چسپاں کرتے ہیں اور یہ صورت ان کے یہاں بہت زیادہ ہے۔ اس سے

ضافہ حشو کے ساتھ ساتھ تعقید کی ناگوار صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔ صرف دو تین مثالوں سے ان کے اس طرزِ عمل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

مرے صنم کو ہوا ان دنوں جو شوقِ نماز — اذانیں ہونے لگیں زاہدا کلیسا میں

(۱۹۵)

دھیان آجاتا ہے پیری میں چراغِ گور کا — نوجوانوں کے دلا رخسارِ تاباں دیکھ کر

(۱۱۸)

کرنے لگے ہیں برگِ خزاں شورشِ جنوں — شاید قریب آئے دلا دن بہار کے

(۲۹۸)

آب دار اشعار سے تیغِ زباں ہے آب دار — گوہرِ مضموں دلا جوہر ہیں اس تلوار کے

(۳۱۷)

باعثِ گردش ہوا یہ وحشت آبادِ جنوں — بیٹھے تھے کنجِ لحد میں ہم جنوں آرام سے

(۳۰۲)

دکھلانا بٹھلانا جیسے مصادر کو اور ان کے مشتقات کو فہرستِ متروکات میں درج کیا گیا ہے، اس بنا پر کہ ان میں لام زائد ہے۔ ناسخ کے یہاں افعال کی یہ صورتیں بالعموم استعمال ہوئی ہیں۔ اسی کے ساتھ افعال کی اور صورتیں جیسے کروانا، جاویں، رودیں وغیرہ کو بھی شامل کر لیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ شعرائے دہلی کا جو طرزِ عمل تھا وہی ناسخ کے یہاں پایا جاتا ہے۔ دو چار مثالوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دیکھیں ہیں اسے نخل میں گل اور ثمر ساتھ (۲۲۹)

ضعف اگر جانے نہ دے ہم کو تو رو دیں اس قدر (۴۴۶)

ترک کرواتا ہے عشقِ سادہ رو (۲۶۴)

ناصحا، چاکِ جگر سلوانے کی فرصت کہاں (۲۵۸)

ساقیِ شیریں ادا پانی پلا دے گا اگر (۱۹۱)
کبھی دکھلائیے بدن اپنا (۲۰)
چوٹی کو اور زلف کو دکھلا کے یہ کہا (۱۵۴)
اغیار کو بٹھلاتے ہو، اٹھواتے ہو مجھ کو (۲۱۱)
مفصّل نسب اپنا بتلائیے (۳۷۲)

افعال کا یہ انداز ناسخ کے یہاں عام ہے اور اس میں وہ بالکل دہلوی شعرا کے مماثل ہیں۔ مصدر کو مع اضافت نظم کرنا دہلوی شعرا میں عام رہا ہے۔ مومن و غالب کے یہاں تو یہ جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح فارسی افعال کے ایسے لفظی ترجمے بھی اُن کے یہاں عام ہیں جو آج ہم کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ ناسخ کا طرزِ عمل بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ مثلاً:

خانۂ تاریکِ قالب میں وہیں در آئے ہم ۱۸۱
جلد اب فصلِ بہار آئے، کہیں کار چلے ۲۶۱
بہت کر کر کے گرمی غیر سے وہ سوختت رہتا ہے ۲۰۲
بعدِ مردن بھی ہمارے پانو میں زنجیر ہے ۳۲۷
نہیں عشاق کو آرام ممکن بعدِ مردن بھی ۲۹۲
داغ ہائے یاس کی سوزش خوش آتی ہے مجھے ۲۵۷
گانا نہ کسی کا اُسے تا زیست خوش آیا ۱۲۱
ہنس دیا تو نے تو گویا تیرے دانتوں سے صنم ۶۶

یہ قاعدہ ہے کہ بہ حالتِ عطف و اضافت اعلانِ نون نہیں ہونا چاہیے۔ ناسخ اور آتش دونوں کے یہاں اس کی مکمل پابندی ملتی ہے۔ لیکن یہ قاعدہ پہلے سے موجود تھا۔ شعرائے دہلی اس کی لازماً پابندی نہیں کرتے تھے۔ مرثیہ گو حضرات سے قطعِ نظر، دیگر شعرائے لکھنؤ نے اس

کی التزاماً پابندی کی۔ انشا نے دریائے لطافت میں اس قاعدے کو لکھا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ قاعدہ بھی تھا کہ جب عطف واضافت نہ ہو تو خوؔن، جاؔن، دیؔن کی قسم کے الفاظ کو بہ اعلان نظم ہونا چاہیے اور زنداں وغیرہ کی طرح کے لفظوں کو بغیر اعلان۔ ناؔدر نے بھی اس قاعدے کو لکھا ہے: "از انجملہ ہے کہ جو نون آخر الفاظِ عربی و فارسی میں آتا ہے، اگر وہ بے کسی ترکیب کے ہو، تو بہ اعلان موزوں کیا جائے۔ جیساکہ اس مصرع میں ہے۔ طبیب: کپڑے اتارتے ہیں بُلا کر مکان میں۔ مگر چند لفظ ایسے بھی ہیں جن میں یہ قاعدہ قائم نہیں رہتا، مثلاً گراں اور خزاں اور رواں اور دواں اور طپاں اور نہاں وغیرہ ذالک۔ ان میں اعلان نہیں چاہیے اس لیے کہ روزمرہ کی گفتگو میں فصحا بہ اعلان نہیں بولتے۔" (ص ۳۰)
ناسخ کے یہاں اس قاعدے کی پابندی نہیں ملتی۔ یعنی جن مفرد لفظوں کو بہ اخفاے نون نظم ہونا چاہیے، وہ اعلانِ نون کے ساتھ بھی نظم ہوئے ہیں اور جن کو بہ اعلان نظم ہونا چاہیے وہ بہ اخفا بھی موجود ہیں اور یہ ناسخ کا عام انداز ہے۔ بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

عریاں دیکھ کر جو لپٹنے کو میں ہوا	۲۹۸
نکلے یہ استخواں مرے جسمِ زار سے	۲۹۸
یوسف کو لے کے کرہی گیا کارواں کوچ	۹۰
کرتا ہوں گھر سے صبح کو میں ناتواں کوچ	۹۱
میری تُربت پہ اسی طرح چراغاں کرو	۲۰۸
تارے بنے ہیں دانت فلک کے دہاں میں	۲۰۳
کیوں نہ کپڑے پھاڑ کر عریاں اب ناسخ پھرے	۱۱۸
مثلِ دہنِ تنگ ہے زنداں ہمارا	۳۸
پروانوں کا خوں شمع پہ ثابت ہے وگرنہ	۱۵۷

داغ، نالہ۔ مرغِ دل، کباب ہوا ۱۱
مستی ہے سرخ، کوزۂ سیہ اور دبیں سفید ۹۹
پڑ گئے چھالے، جلی خوں سے زباں شمشیر کی ۲۴۰

ناسخ، آتش اور ان کے اکثر تلامذہ کے یہاں یہی صورت ہے۔ رشک کے دواوینِ مطبوعہ کا بھی یہی حال ہے۔ یہی صورت دہلوی شعرا کے کلام کی ہے۔ ان کے یہاں بھی یہ طرزِ عمل عام ہے۔ اصل میں ناسخ کے شاگردوں میں سے منیرؔ نے سب سے زیادہ اعلان و اخفاے نون میں شدت اختیار کی ہے ایک جگہ مجبور ہو کر کہتے ہیں:

منیرؔ افسردہ ہوں پابندیِ عطف و اضافت سے وگرنہ لطف دکھلاتا مضامینِ گریباں کا

منیرؔ کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ مرحوم حضرت اثرؔ لکھنوی نے رسالۂ الحمرا لاہور کی کسی اشاعت میں لکھا تھا جو اُن تک روایۃً پہنچا تھا کہ منیرؔ اپنے اس مطلع پر:

گنبدِ قبرِ دوستاں ٹوٹے اے زمیں، تجھ پہ آسماں ٹوٹے

زانو پر ہاتھ مارتے تھے کہ کیا اچھا مطلع ہے لیکن افسوس، دیوان میں نہیں رکھ سکتا، کیوں کہ آسمان بغیرِ عطف و اضافت نظم ہوا ہے، لیکن نون کا اعلان نہیں ہوتا۔ نادرؔ نے جو کچھ لکھا ہے، یہ غالباً منیرؔ کے طرزِ عمل سے متاثر ہو کے لکھا ہے۔

تعقید و تنافر اس زمانے میں عام تھا، آج بھی عام ہے۔ دہلوی شعرا کے یہاں اس کی بہتات ہے۔ ناسخ کے کلام کا بھی یہی حال ہے۔ تعقیدِ لفظی و تنافرِ حروف کی اتنی ہی اور ویسی ہی مثالیں ناسخ کے کلام سے پیش کی جا سکتی ہیں، جتنی اور جیسی مثالیں مثلاً ذوقؔ کے دیوان سے برآمد کی جا سکتی ہیں یا اُس عہد کے کسی اور شاعر کے کلام سے۔ تعقید اور تنافر کا کبھی کبھی شعر کی روانی پر نہایت بُرا اثر پڑتا ہے۔ شعراے دہلی اس کا زیادہ لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ ناسخ کا طرزِ عمل بھی بالکل یہی تھا۔ اور ان کے ایسے اشعار کا حال ویسا ہی سقیم ہے، جیسے شعراے دہلی کے ایسے اشعار کا ہو جایا

کرتا تھا۔ کچھ مثالوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ناؔدر نے تعقیدِ لفظی کی بھی خاصی مذمت کی ہے۔ چوں کہ تعقید و تنافر ایک عام صفت ہے، اِس لیے اِس ذیل میں دیوانِ اول کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن زیادہ مثالیں دوسرے دیوان ہی سے پیش کی گئی ہیں۔ یہ اس لیے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اول و آخرِ کلام میں یکساں صورت پائی جاتی ہے:

اے سحاب اپنی نورانی دکھا صورت ہمیں ۱۹۰
پتھر لگا ہے جو مجھے اس میں شرر نہیں ۱۹۰
جوہروں کی تیغ دخنجر کو بھی جوشن چاہیے ۲۴۴
چھوڑ کر ہم کو جو اپنے گھر کے وہ اندر چلے ۲۴۶
آنکھ میری جا پڑی مسجد کی جو محراب پر ۱۱۳
ہر اک ہوتی تھی مشکل آساں شتاب ۳۷۶
کروں چاروں اُن عورتوں کا بیاں ۳۷۸
شور سُن کر اُس پری کا بند در ہو جائے گا ۱۲
حشر میں کیوں کر خدا کا پائیں گے دیدار ہم ۱۱۸
اُسی کی چوب کا شانہ ہو تیری زلفوں میں
جو بن گیا تھا عصا سانپ دستِ موسیٰ میں ۱۹۵
ہم کہاں رکھتے نہیں اے محتسب پنہاں شراب ۱۹۷
ہمارے دیکھتے ہو داغ، آفریں، دیکھو ۲۰۵
نہ مجھے کرنے دیا ساغرِ اوّل خالی ۲۴۸
کمال آپ کے جلوے سے بام روشن ہے ۲۶۹
بیٹھا نہیں تلے شجرِ میوہ دار کے ۲۹۸

کرتے ہیں بدلے تڑپنے کے اسیرِ دام رقص

بس کمر سے ماہِ نو کا مجھ کو خنجر کھول دے ۳۲۴

جو زمیں شعر کی ہے ایک ہے وادی مجھ کو ۲۸۰

تین دن کو اے فلک کیا چاہیے نوبت ہمیں ۱۹۱

پیٹھوں سے تیر توڑ کے سینے گزر گئے ۳۳۲

اس تحریر میں اس سے زیادہ مثالیں پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ انہی مثالوں سے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صورتِ حال کیا ہے۔ تنافرِ حروف کی بھی چار چھے مثالیں محض بہ طورِ نمونہ نقل کی جاتی ہیں:

ہماری جامہ دری میں ہے گل کی کب تقلید ۱۹۱

آپس میں ہے حسینوں کو بھی رشک کس قدر ۱۹۰

سایہ ساں خونِ سیہ بھی چلے جلاد کے ساتھ ۲۲۸

جانِ شیریں نے نہ دی دیکھ لو فرہاد کے ساتھ ۲۲۸

وہ یوں چلے کہ کوئی ساغر شراب چلے ۲۳۶

وہی مشرک ہے جو جدا جانے ۲۹۵

آج اس ظلمت کدے میں میں سکندر ہو گیا ۷

مرا برنگِ رگِ گل بدن نزار ہوا ۸

خاتمۂ بحث کے طور پر ذیل میں کچھ شعر کسی تخصیص کے بغیر درج کیے جاتے ہیں خط کشیدہ حصوں سے واضح ہوگا کہ ان سب میں دہلوی شعرا جیسا عام انداز کار فرما ہے:

کیوں نہ ہو وہ نوجواں برسات میں رنگیں لباس　　　　ہیبرِ گردوں تک شفق کا لال جوڑا چاہیے

۲۹۸

ہم بے کدے میں آئے تو خالی نظر پڑے　　　　رہتے تھے خُم شراب کے اوّل بھرے ہوئے

۲۹۶

کسی کو میں نے دبوچا کنار میں نہ کبھی
ہوا ہے گور میں کس واسطے فشار مجھے

۲۸۹

جنوں رہا، گلِ داغِ جنوں شگفتہ رہے
تمام عمر رہا موسمِ بہار مجھے

۲۸۹

دھیان اس بُت کا ہے دل میں، لب پہ آہ
ہے خفی وہ ذکر، تو یہ جہر ہے

۲۶۴

کفر میں کامل ہو ناسخ، گر تجھے ایماں نہیں
۱۵۴
داغ ہائے یاس کی سوزش خوش آئی ہے مجھے
۲۵۷
تا نہ ہو لب ریز ساغر، بے صدا ہوتا نہیں
۱۳۱
ناسخ نہ تاب ہے کہیں صورتِ سوال کی
۲۴۶
دل ملکِ انگریز میں جینے سے تنگ ہے
۲۴۸
بادۂ گل گوں سے رنگو جامۂ احرام کو
۲۰۹
[غالب کا مصرع یاد آتا ہے: ہر سلحشور انگلستاں کا]
ہجر میں جینے سے جی بے آس ہے
۲۷۴
چند مدت عالمِ شہرِ خموشاں دیکھیے
۲۷۲
جتنے ہیں صاحبِ سخن، ان کی طبیعت نرم ہے
۱۵۶
وہ زمیں ہے کون، جس پر آسماں ہوتا نہیں
۱۵۶
کیا چھپیں میرے داغ پھاہوں سے
ڈھانپ لے ابر آفتاب نہیں
۱۴۴
ساقیا گردش نصیب ایسا ہوں، جو مرنے کے بعد
خود بہ خود محفل میں میری خاک کا ساغر چلے
۲۴۷

آبِ حیات بن گئی ناسخ شراب صاف
جو اس نے جامِ آب سے اپنے لگائے ہونٹھ ۲۲۷

مارِ سیاہ یہ لیے بیٹھے ہیں اپنے تخم
زلفوں کے نیچے گوشِ صنم میں گہر نہیں ۱۹۰

کہ کبھی ذرّہ اضطراب نہیں ۱۴۴
[میر حسن کا مصرع یاد آگیا: نہ ہو تجھ کو ذرّہ کبھی اضطراب]

سنگ دل سے صاف دل پیدا جو ہو، کب ہے محال ۲۳۲
پتھر لگا ہے جو مجھے۔ اس میں شرر نہیں ۱۹۰

ضعف سے جنبش نہیں بہرِ اشارت ہاتھ میں ۱۴۹
زانوِ فکرت سے اے ناسخ تو اپنا سر اٹھا ۶۱

نشے سے لال ہوئی ہیں جو یہ چشمانِ سیاہ ۱۵۰
ناسخ، ان روزوں رقیبوں کا وہ ہمدم ہوگیا ۱۸

ایسی مرے بدن کی ان روزوں لاغری ہے ۲۶۱
پس از فنا بھی کسی طور سے قرار نہیں ۱۹۱

خاک کا بعد از فنا ہونا ہے مدفن خاک ہیں ۱۹۹
ان کے اس استعمال کو خلافِ فصاحت قرار دیا گیا ہے [رسالۂ اصلاح اور رسالۂ افادات]

ہوا ہوں قاصدِ جاناں کے آنے سے مایوس
سوائے پیکِ اجل اب تو انتظار نہیں ۱۵۱

جو علمِ غیب نہیں ہے سوائے عالمِ غیب
ہلاک جان نہ کر آج فکرِ فردا میں ۱۹۵

تو وہ اوّل ہے حسینوں میں کہ ثانی ہی نہیں

ورنہ جو اوّل ہے جانی اس کو ثانی چاہیے ٣١٠

کبھو ناسخ کی طرف سے اس پری کو قاصدا ٣١٣

جسمِ خاکی کو یہیں چھوڑیں، عدم کی راہیں

اب وطن کو چلیے گردِ دشتِ غربت جھاڑ کر ۴١١

سیکڑوں خانۂ زنجیر کو آباد کیا ١٨

تلے اس کے اُترے رسولِ خدا ٣٧٠

ہائے اب تک مجھ سے وہ حورا شمائل دور ہے ٢٨٥

طرف قبلے کے روئے پُر نور تھا ٣٧٧

لفظِ عرصہ بمعنی مدّت کو ناسخ نے متروک بتایا ہے۔ دہلوی شعرا کے یہاں اس کا استعمال عام ہے۔ جیسے: عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے (غالب) ناسخ کے یہاں بھی یہ لفظ موجود ہے: عرصہ اپنی زندگانی کا مگر اک خواب تھا (ص ۴٢ دیوانِ اوّل) بات دراز ہو گئی، لیکن اس ضروری تفصیل کے بغیر حقیقت واضح نہیں ہو سکتی تھی۔ بات یہ ہے کہ ناسخ نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اُس وقت لکھنؤ میں دہلی کے مہاجر شعرا سب کچھ تھے۔ عام زبان میں کچھ تغیرات پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن چوں کہ شاعری پر انھی شعرا کی حکومت تھی، اور وہی مثال و معیار کی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے شروع میں ناسخ کو اسی زبان اور طرزِ عمل سے دوچار ہونا پڑا۔ ناسخ خود کسی کے شاگرد تھے نہیں، اس لیے آغازِ شاعری میں کسی تغیر کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

بعد کو جب انھوں نے نام نکالا اور جب مسندِ استادی پر متمکن ہوئے، تو شہرت اُن کے اُس نئے طرز کی تھی جس میں جادو کا سا اثر تھا اور اُسی کی طرف ان کی توجہ زیادہ مبذول رہی۔ آتش کے مقابلوں نے اِس رنگ کو اور زیادہ گہرا کرنے میں

مدد دی ۔ زبان کی حیثیت ثانوی رہی
البتہ یہ ضرور ہے کہ عربی کی تعلیم کی وجہ سے ۔ شروع ہی سے ناسخ کی توجہ عربی فارسی الفاظ کی صحت پر مبذول رہی۔ فارسی عربی کے ثقیل لفظ بھی اسی راستے سے بڑھتے چلے آئے ۔ دہلوی شعرا کے یہاں صحتِ لفظی کا اس قدر اہتمام کبھی نہیں رہا ۔ اس میں ناسخ ممتاز ہیں لیکن ثقیل لفظ بھی دہلوی شعرا کے یہاں اس طرح نہیں ملیں گے ۔
افعال کی ایک خاص صورت : آئے ہے ، جائے ہے وغیرہ بھی ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی، جب کہ دہلوی شعرا کے یہاں ایسے افعال برابر ملتے ہیں ۔ تراکیبِ مہند کے قاعدے کی بھی انھوں نے پابندی کی (حتی الامکان) اور عطف و اضافت کی صورت میں اعلانِ نون بھی ان کے یہاں نہیں ۔ جب کہ معاصر دہلوی شعرا کے یہاں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں ۔
فارسی کے لفظوں کو بہ اضافۂ یائے مجہول نظم کرنا دہلوی شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے ۔ جیسے : سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے ۔ یا جیسے جاکو جائے ۔ ناسخ کے یہاں یہ صورت بھی موجود نہیں ۔ کسو اور کبھو تو وہاں بھی گویا متروک ہو چکے تھے ۔ دیوانِ غالب کے ایک مطبوعہ نسخے میں کاتب نے کسی کو کسو لکھ دیا تھا ۔ اس کو انھوں نے اپنی منطق کے خلاف لکھا ہے اور بعد کے نسخے میں تصحیح کر دی ہے ۔ قافیے میں البتہ ان کا گزر ہو جاتا تھا ، لیکن بہ طورِ شاذ ۔ ناسخ کے یہاں یہ شاذ صورت بھی نہیں پائی جاتی ۔ محاورے اور تذکیر و تانیث اور بعض الفاظ کا ترک و اختیار ، یا بعض لفظوں کی صورت میں کسی طرح کی تبدیلی ؛ یہ سب باتیں عام سطح پر ہر جگہ کچھ نہ کچھ ضرور بدلتی رہتی ہیں ۔ لیکن ان کا لازمی تعلق شاعری سے نہیں ہوتا ۔ یعنی یہ لازم نہیں ہوتا کہ ان تبدیلیوں کو شعرا بروئے کار لائے ہوں ۔ ہاں ان کا اظہار شاعری میں نمایاں طور سے ہوا کرتا ہے ۔ ایسی اصطلاحات کو کسی ایک فرد سے منسوب کرنا درست نہیں ۔ شوق نیموی نے رسالۂ اصلاح

میں عنوانِ متروکات کے ذیل میں لکھا ہے:

"جس طرح میر و مرزا نے ولی و حاتم کے اکثر مستعملہ الفاظ ترک کر دیے تھے، اُسی طرح ناسخ وغیرہ نے بھی میر و مرزا کے بہت سے الفاظ متروک کر دیے۔"

اور پھر اس لفظِ "وغیرہ" پر درجِ ذیل حاشیہ لکھا ہے:

"اس لفظ سے اِس امر کا اظہار مقصود ہے کہ شیخ ناسخ کے ساتھ اور شعرا بھی زبان کی اصلاح میں شریک ہیں۔ جب مومن و آتش وغیرہ کا کلام بہت سے اگلے رکیک مستعملات سے پاک ہے تو میں ان لوگوں کے مصلحِ زبان ہونے سے کیوں کر انکار کر سکتا ہوں۔ ہاں اس کو مانتا ہوں کہ ناسخ مرحوم نے اس طرف زیادہ توجہ کی۔"

یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ شعوری طور پر اصلاحِ زبان کا عمل شاہ حاتم کے زمانے سے برابر کارفرما رہا ہے۔ البتہ دہلوی شعرا نے اس کو التزام کی حیثیت کبھی نہیں بخشی اور یہ نہایت مناسب طرزِ عمل تھا۔ تغیرات زبان میں بہ تدریج ہوتے ہیں اور بہ تدریج ہی وہ جگہ بناتے ہیں۔ اس تدریجی عمل کے دوران میں ہوتا یہ ہے کہ نامناسب التزامات اپنا اثر کھو بیٹھتے ہیں اور مناسب اختراعیں اور ایجادیں زبان کا جز بن جاتی ہیں۔ کوشش کر کے کوئی فرد یا چند افراد یہ طے کر لیں کہ آج سے یہ لفظ استعمال نہیں کیے جائیں گے، یا افعال کی یہ صورت متروک قرار دی جائے گی، تو اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ تدریجی عمل ظہور میں نہیں آنے پاتا، جس سے ترک و اختیار کا کام قدرتی طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے لکھنؤ کے اکثر متروکات نہ تو قبولِ عام پا سکے، یعنی یہ کہ خود لکھنؤ کے سب شاعروں نے ان کی پابندی نہیں کی۔ اور نہ وہ دیرپا ہو سکے، کیوں کہ زبان کی خارجی سطح تک

محدود رہے۔ گئے ہے، جائے ہے جیسے فعل، اور سدا، جوں، نین، میاں جیسے بہت سے لفظ آج پھر نمود حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح تراکیبِ ہندی، سقوطِ حروفِ علّت، اعلانِ نون جیسے قاعدے بھی اپنی قطعیت کھو رہے ہیں۔ آج بالکل وہی صورت ہے، جو اس زمانے میں دہلوی شعرا کا طرزِ عمل تھا، کہ قاعدے ہیں، لیکن ان پر عمل بہ قدرِ ضرورت اور بہ وقتِ ضرورت ہوگا۔ قاعدے کی خاطر لطفِ سخن کو قربان نہیں کیا جائے گا۔ قاعدہ معاون ہوگا کہ اُس کی مدد سے (پابندی سے نہیں) کچھ اور حُسن پیدا کیا جائے۔ یہ نہیں کہ اس کی پابندی کی خاطر کچھ کھو دیا جائے۔

دہلی و لکھنؤ دونوں میں زبان میں تغیرات ضرور ہوئے، لیکن اس سلسلے میں ایک یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ دہلی میں تغیرات کے ظہور اور فروغ کی رفتار ہمیشہ مدھم رہی۔ اِس کی کئی وجہیں تھیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دہلی میں مختلف سطحوں پر روایت کا گہرا اثر تھا اور اس روایت کا سلسلہ بہت پرانا تھا۔ مزاجوں پر بھی اس کا اثر تھا، اس کے ساتھ ساتھ دہلی میں علاقائی اثرات بھی زبان سے قریب رہا کرتے تھے۔ اس کی تشکیل وارتقا میں بھی ان اثرات کا عمل دخل تھا۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں بالکل ابتدائی سطح پر مختلف اثرات کی آمیزش کا یہ عمل ظہور میں نہیں آیا تھا۔ ادبی زبان کا ایک تشکیل شدہ اور ترقی یافتہ روپ وہاں پہنچا تھا، اور اس روپ میں نئی تراش خراش کے اضافے کیے گئے۔ اس لیے روایت کے وہ اثرات یہاں سدِّ راہ نہیں تھے جو وہاں تھے۔ یہاں ہر چیز نئے سرے سے ترتیب پارہی تھی۔ مزاج پر اس کا اثر پڑنا لازم تھا، اس لیے یہ آسانی تھی کہ کسی بھی پرانی چیز کو اچانک چھوڑ دیا جائے اور ایک نئی چیز کو بہ آسانی اختیار کرلیا جائے۔ اسی وجہ سے یہ ہوا کہ یہاں زبان میں جن تبدیلیوں کو لازم قرار دیا گیا وہ تبدیلیاں بہ آسانی اپنی جگہ بناتی گئیں اور لوگوں نے آسانی کے ساتھ اس کی پابندی بھی کی، بلکہ اس پابندی کو اس

لیے بھی ضروری سمجھا کہ اس طرح بھی امتیاز کا رنگ چمکایا جا سکتا تھا۔
ایک بات یہ بھی ہے کہ دہلی میں کسی طرح کا حریفانہ تقابل درپیش نہیں تھا، نہ زبان کو نہ شاعری کو، اس لیے وہاں فروعات کو اس قدر گہری نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا اور نہ پابندیوں پر اس قدر زور دیا جا سکتا تھا۔ یہاں صورتِ حال برعکس تھی کہ زبان کو بھی حریفانہ انداز سے دیکھا جانے لگا تھا اور شاعری میں بھی اس کی کرشمہ کاریاں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ اس لیے یہاں توجہ کی نظر کو بھی سخت گیر ہونا چاہیے تھا۔
یہ کہا جا چکا ہے کہ دونوں دبستانوں کی شاعری میں مزاج کا فرق بہت نمایاں ہے اور یہ مزاج خارجیت پسند ہے۔ ظاہر آرائی اس کو محبوب ہے، ہر چیز میں، وہ زندگی کے آداب ہوں، یا شاعری کی رعایتیں۔ متروکات، نئے نئے قاعدوں کی پابندی، اور ان کی مدد سے شعر کا ظاہری بناؤ سنگار، یہ عمل اس مزاج سے میل کھاتا تھا، اس کو خوب راس آتا تھا، یہ وجہ بھی ہے کہ لکھنؤ میں بہ مقابلہ دہلی، لفظی تصرفات، تغیرات اور نئے نئے قاعدوں کی پابندی کو ایسی پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا کہ جلد ہی وہ شاعری کا دین ایمان ہو گئے۔ داخلیت پر توجہ بھی کم تھی اور اس کی ضرورت بھی اس معاشرے کو نہیں تھی، اس لیے لفظی کاروبار کی گرمیِ بازار ضروری تھی۔ اور یہ گرمیِ بازار اس حد تک بڑھی کہ اساتذہ نے اپنے اپنے متروکات و مختارات کی فہرستیں الگ الگ مرتب کرنا شروع کر دیں۔ اور پھر یہی نہیں، بعض حضرات نے کوشش کی کہ ایسی ایسی پابندیوں کو لازم کیا جائے کہ شعر کہنے کی جو ایک تہمت لگی رہ گئی ہے وہ بھی باقی نہ رہے، بس شعر بنانے کا کام باقی رہ جائے۔ دہلی میں اس طرح کی فہرست نگاری اور اس انداز کی کوہ کنی نظر نہیں آئے گی۔ بات وہی مزاج کی ہے اور یہ مزاج معاشرت کے عناصر سے بنتا ہے۔

ناسخ کا یہ کام ضرور ہے کہ اُن کے آغازِ شاعری تک جس قدر متروکات کی نشان دہی

کی جا چکی تھی، ان میں سے اکثر کو انھوں نے ترک کر دیا اور سختی کے ساتھ اس کی پابندی کی۔ دہلوی شعرا سختی کے ساتھ پابندی کبھی نہیں کر سکے تھے۔ لیکن قواعدِ شاعری اور متروکات کی جن فہرستوں کو اُن کے شاگردوں نے یا دوسروں نے مرتب کیا اور ان سب کا سلسلۂ نسب ناسخ تک پہنچا دیا، ان سے ناسخ کا کچھ تعلق نہیں۔ ناسخ کا اصل کارنامہ ایک اسلوب کی تشکیل ہے۔ اس اسلوب نے ایک نئی روایت بنائی تھی۔

ایک یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ابھی تک متروکات کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے اور نہ دہلی و لکھنؤ کے واقعی اختلافات کی صحیح صحیح نشان دہی کی جا سکی ہے۔ اس ناتمامی کا یہ نتیجہ ہے کہ بعض اوقات محض قیاس سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ لفظ دہلی میں یوں تھا اور لکھنؤ میں یوں ہوا۔ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کروں گا۔ آزاد نے آبِ حیات میں ترجمۂ ناسخ میں، ناسخ کے چار شعر نقل کیے ہیں جن میں لفظ اندھیار[1] نظم ہوا ہے۔ ان شعروں کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

> "اگرچہ دلی میں بچے سے بوڑھے تک اندھیری رات کہتے ہیں، مگر لکھنؤ والوں کو ٹوکنے کا منہ نہیں۔ کیوں کہ جس خاک سے ایسے ایسے صاحبِ کمال اٹھیں، وہاں کی زبان خود سند ہے۔"

مطلب یہ نکلا کہ دہلی میں اندھیری تھا، لیکن لکھنؤ والوں نے اندھیاری[1] استعمال کیا۔

---

[1] دہلی میں اندھیرا، اندھیری زیادہ رائج تھا۔ لکھنؤ میں بھی ایک مدت کے بعد اسی طرف پھر بازگشت ہوئی۔ صاحبِ نورالغات نے متروکات کے ذیل میں لکھا ہے: "اندھیاری، اندھیارا۔ اس جگہ فصحائے حال اندھیرا، اندھیری بولتے ہیں۔" (مقدمہ جلد اوّل)

حضرت اثر لکھنوی نے اپنے لغت فرہنگِ اثر میں اس قول کے ذیل میں لکھا ہے

"یہ ادعا ایک حد تک درست ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اندھیارا اور اندھیاری کو

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحے پر)

اور یہ لکھنؤ کا تصرف ہے۔ لیکن یہ قول کلیتہً صحیح نہیں۔ سودا نے دہلی کے کوتوال کی ہجو میں جو مثنوی لکھی ہے اور جس کا عنوان ہے "در بے نسقیِ شاہ جہان آباد" اس میں وہ لکھتے ہیں:

ہو گی کب تک بچہ خبرداری　　　چور جاتے رہے کہ اندھیاری

اس طرح کی اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مفصل جائزے کے نہ ہونے سے یہ بڑا نقصان ہے کہ دہلی و لکھنؤ کی زبان کے متعلق ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں، جو بجائے خود صحیح نہیں ہوتیں۔ جانب داری کی چشمک اس فہرست میں اضافے کرنا روا رکھتی ہے۔

ہاں اندھیاری کی طرح اندھیارا بھی سودا کے یہاں موجود ہے۔ ایک رباعی کا پہلا شعر ہے۔

میں دیر و حرم ڈھونڈھ کے یارو ہارا　　　دونوں میں نہ پایا آئے بجز اندھیارا

ناسخ کی حقیقی اہمیت یہ نہیں ہے کہ انھوں نے شاعری کے قواعد بنائے، یا متروکات کا تعین کیا، یا تذکیر و تانیث کے ضابطے مرتب کیے، یا کوئی نئی زبان ایجاد کی۔ اُن کی اہمیت

صفحہ ما سبق کا بقیہ

متروک قرار نہ دینا چاہیے۔ ان کو بھی رہنے دیجیے اور موقع موقع سے کھپائیے۔ میں نے اس بدعت کا اقدام کیا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ اندھیارا متروک سمجھا جاتا ہے:

پانو میں چھالے، راہ میں کانٹے، آنکھ تلے اندھیارا ہے
ڈوبتے دل کی آس نہ توڑو، ہار کے تم کو پکارا ہے۔

(فرہنگِ اثر ص ۸۷)

یہ وہی طرزِ عمل ہے جو شروع سے دہلی والوں کا رہا ہے۔ متروک کرنے سے زیادہ توجہ اس پر رہی ہے کہ لفظوں کو موقع موقع سے استعمال کیا جائے۔ تقریباً سو برس کے وقفے کے بعد اب اُس قواعد پسندی اور سخت گیری نے شکست پائی ہے جس کو تلامذۂ ناسخ اور اُن کی ذریات کی دقت پسند لیکن غیر شاعرانہ طبیعتوں نے رواج دیا تھا۔ اور دہلوی شعرا کے طرزِ عمل کو پھر سے فروغ مل رہا ہے۔

یہ ہے کہ انھوں نے ایک نئے معاشرے کو، جو خاص حالات میں فروغ پذیر تھا، ایک نیا شعری اسلوب بلکہ پیرایۂ اظہار عطا کیا۔ جس میں اُس معاشرے کی طرح ظاہری بلند آہنگی، ظاہرداری اور رعایتوں اور تلازموں کی چمک دمک موج زن تھی۔ انھوں نے تشبیہوں اور استعاروں کا وہ انداز نمایاں کیا جس میں طلسمات کا سا عالم تھا، نیا پن تھا، اور معاشرت کی بہت سی پسندیدہ چیزوں کا عکس اس میں جھلکتا تھا۔ انھوں نے شاعری میں خارجیت کے نشوونما کا باب ایک نئے انداز سے کھولا۔ "سادہ گوئی" کو غزل کی قلم رو سے خارج کر دیا۔ اور بیان و مزاج دونوں کے لحاظ سے اُس کو پُرانی غزل گوئی کی روایت سے مختلف بنا دیا۔ لفظوں کے تلازموں کے نئے نئے رُخ نمایاں کیے جس سے خیال آفرینی کی نئی وسعتیں سامنے آئیں، اور نئے امکانات روشن ہوئے۔ شاعری کو داخلیت سے بے تعلق یا بے نیاز بنا کے تصوف سے اس کا رشتہ توڑ کے اور جذباتیت سے بچا کر، دوسرے عناصر سے اس طرح سجایا کہ اُس عہد میں وہ اُس معاشرے سے ہم آہنگ ہوگئی۔

لیکن اس سے بھی اہم کام یہ انجام دیا کہ دبستانِ لکھنؤ کو سند اور مثال کا ایک معیار عطا کیا۔ ورنہ اُن سے پہلے تک، بلکہ ان کے ابتدائی زمانے تک معیار اور سند دونوں کے لیے دہلی کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ اب خود لکھنؤ کا اپنا ایک معیار تھا، ایک مثالی انداز تھا، جس کی تقلید گویا سب کے لیے واجب تھی۔ ناسخ کو شاعری کی مملکت کا غازی الدین حیدر کہنا چاہیے۔ جس طرح انھوں نے خطابِ شاہی قبول کر کے، اس روایت کا خاتمہ کر دیا جس کی عظمت کے رشتے میں ہر چیز بندھی ہوئی تھی اور اس طرح خود مختاری کا علم بلند کیا۔ اُسی طرح ناسخ نے شاعری کی سرزمین پر لکھنؤ کی خود مختاری کا اعلان کیا۔ گویا اب سے سند اور مثال کے لیے دہلی کی طرف نہیں دیکھنا ہوگا۔ پرانا سکہ منسوخ ہوا اور نئے سکے کا چلن ہوا۔

یہ تاریخ ساز کام تھا، اور یہی اس کی اہمیت ہے۔ تاریخ ساز شخصیت کی حیثیت سے تاریخِ شعر و ادب میں اُن کے کلام کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی کیوں کہ اُن کے کلام کو سامنے رکھے بغیر اُس دور کی شاعری کا اور شعری محرکات کا جائزہ لیا ہی نہیں جا سکتا۔

حالاتِ زندگی

امام بخش نام تھا، ناسخ تخلص۔ لفظِ شیخ نام کا جُز بن گیا ہے۔ جیسے لفظِ خواجہ آتش کے نام کا جُز ہے۔ خواجہ صاحب اور شیخ صاحب سے عموماً یہی لوگ مراد ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ باپ کا نام خدا بخش تھا۔ صاحبِ تذکرۂ ابنِ امین اللہ طوفان نے باپ کا نام عبداللہ لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کے الفاظ ہیں: "عبداللہ نام کہیں اور نظر نہیں آیا۔ مگر محض اس بنا پر اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔" (حواشیِ تذکرۂ مذکور ص ۲۹)

آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ: "خاندان کے باب میں فقط اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔ بعض شخص کہتے ہیں کہ اس دولت مند نے مُتبنّا کیا تھا۔" مصحفی نے ریاض الفصحا میں لکھا ہے: "خلف الرشیدِ شیخ خدا بخش مرحوم۔ وطنِ بزرگانش دارالسلطنتِ لاہور۔ و خودش در فیض آباد تولّد شدہ۔ و بہ لکھنؤ بہ سنِ تمیز رسیدہ۔ ... اجدادش تجارت پیشہ بودہ اند۔ و خود نیز بہمین دتیرہ بسر میبرد۔"

بہر حال، یہ مسلّم ہے کہ ناسخ کو متبنّا کیا گیا تھا۔ اُن کے سر پرست کا تجارت پیشہ ہونا بھی زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ وراثت کا جو جھگڑا ناسخ کو پیش آیا تھا، اس سے اسی قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ مسعود حسن رضوی صاحب نے اپنی کتاب "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ" میں لکھا ہے کہ ناسخ کے والدین کی قبریں لکھنؤ کے مضافات میں ایک سُنّی قبرستان میں انھوں نے دیکھی ہیں۔ ان کے سرھانے کے طاقوں میں پتھر پر تاریخ کا ایک ایک مصرع کندہ ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قبریں ان کے حقیقی والدین کی ہیں یا ان کے سرپرستوں کی ہیں۔ کلیاتِ ناسخ میں قطعہ "تاریخِ وفاتِ والدِ مصنف" موجود ہے لیکن والدہ کی وفات کی تاریخ موجود نہیں۔ یہ مُسلّم ہے کہ ناسخ ابتداءً سُنّی تھے پھر مذہبِ شیعہ اختیار کیا۔ لیکن فی الحال یہ معلوم نہیں کہ یہ تبدیلی کب عمل میں آئی۔

۲۴؍جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) کو انتقال ہوا (دیوانِ رشک)۔ سالِ ولادت کی صراحت کسی تذکرہ نگار نے نہیں کی۔ البتہ مصحفی نے ریاض الفصحا میں یہ لکھا ہے کہ "عمرش سی و ہفت سالہ است"۔ اس سے اندازہ تو کیا جا سکتا ہے۔ قطعی تعین نہیں ہو سکتا۔ البتہ قاضی عبدالودود صاحب نے ایک مضمون میں اس کا تعین کیا ہے:

"کلیاتِ ناسخ مطبوعہ میں ایک شعر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ ۵ محرم کو پیدا ہوئے تھے۔ سالِ ولادت بصراحت کسی تذکرے میں نہیں اور نہ کلیات اس پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن دیوانِ رشک مطبوعہ میں ایک قطعۂ تاریخ ہے، جس کا مادہ یہ ہے "مُرد ای ہی بسالِ شصت و نہم"۔ ناسخ کی وفات، جیسا کہ اسی کتاب سے پتا چلتا ہے، پنج شنبے کے دن چوبیسویں جمادی الاولی کو ۱۲۵۴ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اس حساب سے سالِ ولادت ۱۱۸۵ھ ٹھہرتا ہے۔ رشک، ناسخ کے شاگردانِ خاص میں تھے اس لیے اس سنہ میں شبہے کی مطلق گنجایش نہیں۔"

(سالنامۂ نقوش (لاہور) بابت ۶۲-۱۹۶۱ء)

فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ علمائے فرنگی محل سے بھی پڑھا تھا۔ غالباً عربی پڑھی ہو گی۔ آزاد نے لکھا ہے: "اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی مگر رواجِ علم اور صحبت کی برکت سے فنِ شاعری کی ضروریات سے پوری طرح واقفیت تھی۔ اور نظمِ سخن میں ان کی نہایت پابندی کرتے تھے۔" (آبِ حیات۔ ذکرِ ناسخ)

شاگرد کسی کے نہیں تھے۔ اس سلسلے میں جو روایتیں ہیں کہ مصحفی سے یا تنہا سے مشورہ کیا تھا، موجودہ صورت میں قابلِ قبول نہیں۔ آزاد نے مولوی عظیم اللہ غمی (غمی کے والد، ناسخ کے عزیز دوست تھے۔ غمی تخلص بھی ناسخ کا عطیہ ہے، جس سے یہ قولِ آزاد سالِ تلمذ ۱۲۵۰ھ نکلتا ہے) کے حوالے سے لکھا ہے:

" مجھ سے خود شیخ صاحب نے آغازِ شاعری کا حال نقل فرمایا کہ میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے جو مجھے ذوقِ سخن نے بے اختیار کیا۔ ایک دن اغیار کی نظر بچا کر کئی غزلیں خدمت میں لے گیا۔ انھوں نے اصلاح نہ دی۔ میں دل شکستہ ہو کر چلا آیا۔ اور کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں، فرشتہ تو نہیں، اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دوں گا۔ چناں چہ کہتا تھا اور رکھ چھوڑتا تھا۔ چند روز کے بعد پھر دیکھتا، جو سمجھ میں آتا، اصلاح کرتا اور رکھ دیتا..."

اس روایت کو صحیح نہ ماننے کی بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں۔

اُردو کے تین دیوان اُن سے یادگار ہیں۔ مطبوعہ کلیّات میں دو دیوان پائے جاتے ہیں، لیکن طبعِ اوّل و دوم میں اس کی صراحت موجود ہے کہ دوسرے دیوان میں تیسرا دیوان بھی شامل ہے۔ کلیات کے خاتمۃ الطبع کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دیوان کا نام " دیوانِ ناسخ " ہے۔ یہ نام ناسخ کے شاگرد غنی کا رکھا ہوا ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے بہ قاعدۂ زبر و بیّنات سالِ ترتیب ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۶-۱۷ء) برآمد ہوتا ہے۔ [یہ خیال رہے کہ ۱۲۲۴ھ میں مصحفی نے دیوانِ ششم کے دیباچے میں ناسخ کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان کی شاعرانہ شہرت اور استادانہ اہمیت مسلّم ہو چکی تھی۔ گویا یہ دیوانِ اوّل اس کے کم و بیش آٹھ برس بعد مرتّب ہوا ہے]۔

دوسرا دیوان " در پریشانیِ آمد و رفتِ الہ آباد " مرتّب ہوا تھا یعنی جب وزارتوں کی تبدیلی کے سبب سے ناسخ کو کئی بار لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا۔ اس کا تاریخی نام " دفترِ پریشاں " ہے جس سے سالِ ترتیب ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۳۲ء) برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام ناسخ کا رکھا ہوا ہے۔ تیسرے دیوان کا تاریخی نام " دفترِ شعر " ہے، جس سے سالِ ترتیب ۱۲۵۴ھ نکلتا ہے۔ یہی ناسخ کا سالِ وفات ہے۔ یہ نام رشک کا رکھا ہوا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ناسخ کے مرنے کے بعد اس کی ترتیب بھی رشک ہی نے کی ہوگی اور اس خیال سے کہ اس میں غزلیں کم

ہوں گی، شاید ہر ردیف کی غزلیں بھی مکمل نہ ہوں، جس کو اُس زمانے میں تکمیلِ دیوان کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا، اس لیے تیسرے دیوان کی غزلیں ہر ردیف کے ذیل میں دوسرے دیوان ہی میں شامل کر دی گئیں۔ زیادہ امکان اسی کا ہے کہ یہ کام بھی رشک نے انجام دیا ہو گا۔

ناسخ کا کلیات پہلی بار ذی حجہ ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں میر حسن رضوی رئیسِ محلۂ محمود نگر (لکھنؤ) کی فرمایش سے، مطبعِ محمدی لکھنؤ میں چھپا تھا۔ اس کی کتابت اُس زمانے کے ایک مشہور خوش نویس منشی عبدالحی نے کی تھی، جو لکھنؤ کے مشہور استاد حافظ نور اللہ کے شاگرد تھے۔ مولانا شرر نے گذشتہ لکھنؤ میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے۔

یہ اشاعت ۴۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں سات صفحے کا غلط نامہ ہے، جس پر نمبر علاحدہ سے ڈالے گئے ہیں۔ پہلا دیوان حوض میں ہے۔ دوسرے اور تیسرے دواوین کا مجموعہ حاشیے پر ہے۔ یہ مجموعہ ص ۳۶۶ کے حاشیے پر ختم ہو جاتا ہے۔ ص ۳۶۷ سے حاشیے پر ایک مذہبی مثنوی شروع ہوتی ہے جس کا نام مذکور نہیں، لیکن بعض لوگوں نے اس کو نظمِ ناسخ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس میں حضرت علیؓ کے فضائل مذکور ہیں۔

خاتمۃ الطبع کی عبارت سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بار کلیات کو طبع کرانے کا خیال میر حسن رضوی کے دل میں پیدا ہوا لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی ترتیب کا کام کس نے انجام دیا تھا۔ اس کا امکان ہے کہ یہ کام رشک نے انجام دیا ہو یا کم از کم مشورے میں شریک رہے ہوں اور یہ تجویز اُنھی کی ہو کہ تیسرے (نامکمل) دیوان کو دوسرے دیوان میں ردیف وار غزلوں کے ذیل میں شامل کر دیا جائے۔ بہ ہر صورت کلیات کی تصحیح انھوں نے ضرور کی ہے۔ غلط نامے سے پہلے جو منظوم عبارت درج ہے وہ دس اشعار پر مشتمل ہے، شروع کے اشعار یہ ہیں:

مرتب ہوا جب کہ دیوان سب ؛؛ مجھے قصدِ صحت کا پیدا ہوا۔ تلمذ میں ناسخ کے سیکھا جو تھا ؛ وہ تحریر میں آشکارا ہوا۔ ہوئیں سہوِ کاتب کی لفظیں درست ؛؛ بنا جو کہ نسیانِ املا

ہوا۔ مجھے دخل اس سے زیادہ نہ تھا، تبدّل میں جو کچھ ہویدا ہوا۔ اگر سہو اس پر بھی پائے کوئی
ہوں انسان، اس میں عجب کیا ہوا۔"

اس کے آخر میں مصرعِ تاریخ شامل ہے، جس سے غلط نامے کا سالِ ترتیب ۱۲۵۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کلیات کو اگرچہ ایک مشہور خوش نویس نے لکھا تھا، لیکن اغلاطِ کتابت ضرورت سے زیادہ راہ پا گئیں۔ رشک کا بنایا ہوا غلط نامہ سات صفحوں پر مشتمل ہے، تین کالمی صفحہ ہے، جس کا مسطر ۲۲ سطری ہے۔ کم و بیش ۴۳۷ اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے۔

دوسری بار یہ کلیات شہزادہ فرخندہ بخت بہادر کی فرمایش پر لکھنؤ کے مطبعِ مولائی میں ۱۲۶۲ھ (۴۶-۱۸۴۵ء) میں چھپا تھا۔ اس اڈیشن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ص ۴۰۰ تک یہ صفحہ بہ صفحہ اشاعتِ اوّل کے مطابق ہے۔ اس اشاعت میں ۴۰۲ صفحے ہیں۔ آخری صفحوں میں عبارتِ خاتمۃ الطبع اور قطعاتِ تاریخ کے اختلات کے باعث یہ فرق پیدا ہوا ہے۔ اس میں کوئی غلط نامہ شامل نہیں (جو نسخہ میرے پاس ہے، کم از کم اس کی تو یہی صورت ہے) اشاعتِ اوّل کے غلط نامے کی اکثر غلطیاں متن میں درست کر دی گئی ہیں لیکن کچھ غلطیاں باقی رہ گئی ہیں، البتہ اس اشاعت میں بہت سی نئی اغلاطِ کتابت کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ دونوں اشاعتیں کم یاب ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہ دونوں اڈیشن میرے پیشِ نظر ہیں۔ اس انتخاب کا متن اشاعتِ اوّل پر مبنی ہے۔

کلیات کا ایک اور قدیم اڈیشن وہ ہے جو مصطفیٰ خاں کی فرمایش سے ۱۲۶۷ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے خاتمۃ الطبع کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

"الحمد للہ کہ کلیاتِ دیوانِ شیخ امام بخش ناسخ حسبِ فرمایشِ محمد مصطفیٰ خاں خلفِ حاجی روشن خاں غفر لہا المنان ساکنِ لکھنؤ محلہ محمود نگر در کارخانہ علی بخش خاں بتاریخ بست ہفتم جمادی الاولی ۱۲۶۷ ہجری باختتام رسید"

یہ نسخہ بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ متن کے لحاظ سے اصل اہمیت اشاعتِ اول کی ہے بعد کو اسی کی نقل کی گئی ہے۔

ناسخ سے چار مثنویاں بھی منسوب ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی تو وہی ہے جو کلیاتِ مطبوعہ میں شامل ہے۔ ایک مثنوی سراجِ نظم ناسخ کے انتقال کے بعد رشک نے شائع کی تھی۔ نام تاریخی ہے جس سے سالِ تکمیل ۱۲۵۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام بھی رشک کا رکھا ہوا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کا ایک مضمون اس مثنوی سے متعلق رسالۂ معاصر حصہ ۲ میں شامل ہے۔ ہاں کلیات میں جو مثنوی شامل ہے اور جس کو نظمِ ناسخ کہا جاتا ہے وہ علاحدہ سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں حبیب اللہ غضنفر (ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی) نے اس کو شائع کیا تھا۔ یہ اشاعت میری نظر سے گزر چکی ہے، لیکن فی الوقت پیشِ نظر نہیں۔ سنِ اشاعت ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" سے نقل کیا گیا ہے۔

اِسی کتاب سے معلوم ہوا کہ "شہادت نامۂ آلِ نبی" کے نام سے نولکشور پریس سے ایک مثنوی کئی بار چھپ چکی ہے۔ یہ بھی ناسخ سے منسوب ہے۔ تذکرۂ سراپا سخن کی ایک عبارت کا حوالہ دے کر اس مثنوی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "محسن کی شہادت کے ہوتے فی الحال اس مثنوی کو ناسخ کی تصنیف مانا جا سکتا ہے۔" (ص ۴۳۲)

چوتھی مثنوی معراج نامۂ ناسخ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس سے متعلق راقم الحروف نے ایک تعارفی مضمون رسالۂ اردو کراچی کے شمارۂ جولائی ۶۸ء میں لکھا تھا۔ اس کا مخطوطہ میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ اُس زمانے کی یادگار ہے جب ناسخ سُنّی تھے۔ اس پر اتفاق ہے کہ ناسخ پہلے سنّی تھے، پھر شیعہ ہوئے۔ چوں کہ اس مثنوی میں پچھلے عقیدے کی باتیں بھی تھیں، غالباً اسی لیے ناسخ نے اس کو اپنی تصنیفات میں شمار نہیں کیا۔ ناسخ کے ایک شعر سے اس خیال کی تائید بھی ہوتی ہے:

کیا ہوا گر شعرِ ناسخ ہیں عقیدے کے خلاف   آیۂ منسوخ کیا موجود قرآں میں نہیں

(ص ۱۹۳)

یہ شعر دیوانِ اوّل میں ہے۔
کلامِ ناسخ کے بہت سے مخطوطات مختلف مقامات پر محفوظ ہیں۔ ان میں ایسے مخطوطات بھی ہیں جن میں کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے اور ایسے مخطوطات بھی ہیں جن کی مدد سے ناسخ کے تیسرے دیوان کی غزلوں کا تعین بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کی ضرورت ہے کہ ان مخطوطات کی مدد سے کلامِ ناسخ کا ایک اچھا اڈیشن مرتب کیا جائے، جس میں تینوں دیوان الگ الگ ہوں۔ زبان اور متروکات کی بحث کے نقطۂ نظر سے تینوں دیوانوں کا تعین ضروری ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ضرورت یوں ہے کہ اشاعتِ اوّل کے غلط نامے سے بعض شبہات تعیّنِ متن کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ازالے کی واحد صورت یہی ہے کہ کلامِ ناسخ کو پھر سے مرتب کیا جائے۔ ان شبہات کی کچھ تفصیل اگلے باب میں پیش کی جاتی ہے۔

غلط نامہ یا ترمیمات

اِس کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ کُلیاتِ ناسخ (اشاعتِ اوّل) کا مفصّل غلط نامہ رشک نے بنایا تھا۔ اِس غلط نامے کے مطابق، اشاعتِ ثانی میں اکثر غلطیوں کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ لیکن کچھ غلطیاں باقی رہ گئی ہیں۔ نولکشوری اشاعت کا بھی یہی حال ہے۔ بہ ہر صورت، اب جو متن سامنے آتا ہے اُس کا بیشتر حصّہ رشک کی تصحیحات کی روشنی میں متعین ہوا ہے ـــــ اس سلسلے میں ایک شک کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ غلط نامے میں بعض غلطیوں کی تصحیح اس طرح کی گئی ہے، جس پر تصحیح کے بجائے، ترمیم کا گمان ہوتا ہے۔ دو چار مثالوں سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

کُلیات (اشاعتِ اوّل) میں ص ۲۴۲ پر ایک شعر یوں چھپا ہوا ہے:

چھوڑ کر اپنی تعلّی، کر تواضع اختیار　　　رتبۂ مینارِ مسجد، پست ہے محراب سے

غلط نامے میں "رتبۂ مینارِ مسجد" کو غلط بتایا گیا ہے۔ اس کی جگہ "رتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم" کو صحیح لکھا گیا ہے۔ اب صحیح مصرع یوں ہوا: رتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم محراب سے۔

اس مصرع میں اِس کے سوا کوئی اور غلطی نظر نہیں آتی کہ لفظِ مینار بہ اضافۂ یا نظم ہوا تھا، جب کہ بہ لحاظِ لُغت اصل لفظ منار (میم مفتوح) ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ یہ لفظ بہ اضافۂ یا غلط ہے۔ لفظِ منار کے ذیل میں لکھا ہے: "و درین زمان کہ آنرا مینار گویند بزیادتِ تحتانی، غلطِ محض است"۔

یہی لفظ ایک اور شعر میں نظم ہوا تھا اور وہاں بغیر ترکیب آیا تھا:

طاقِ ابرو کے تصوّر میں کروں نالے بلند
چاہیے مسجدِ عالی کے ہوں مینار دراز　　　(ص ۱۲۲)

غلط نامے میں اس کی بھی تصحیح کی گئی ہے " چاہیے مسجدِ عالی کے ہوں مینار" کو غلط بتا کر، اس کی جگہ " ایسی مسجد کو منارے ہیں سزاوار " کو صحیح لکھا گیا ہے۔ اب گویا صحیح مصرع یوں ہوا: ایسی مسجد کو منارے ہیں سزاوار دراز۔ ایک لفظ کے علاوہ پورا مصرع بدل دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظِ مینار (بہ اضافۂ یا) کو لغت کے مطابق غلط[ٖ1] قرار دیا گیا ہے خواہ وہ ترکیب کے ساتھ آئے یا بغیرِ ترکیب آئے۔

اب یہ دیکھیے کہ تصحیح کا عمل جس طرح ظہور میں آیا ہے، کیا اُس سے یہ بدگمانی نہیں ہوتی کہ یہاں ترمیم کی گئی ہے۔ ایسا عموماً ترمیم کی صورت میں ہوا کرتا ہے کہ مصرع کی صورت ہی بدل جائے۔ یہ ایسی ترمیم ہے جو صرف مصنف کر سکتا ہے۔

کلیات کی اشاعتِ ثانی اور نولکشوری اڈیشن (اشاعتِ ہفتم پیشِ نظر ہے) میں یہ دونوں

---

[1] قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مضمون "جہانِ غالب" مطبوعہ غالب نمبر نیا دور (لکھنؤ) بابت ۶۹ء میں، قاطع القاطع کے حوالے سے لفظِ منارہ سے متعلق ایک دل چسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ اس جگہ اس کی تکرار دل چسپی سے خالی نہ ہوگی۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ لفظِ مینار کے متعلق اُس زمانے کے محتاط لوگوں کی رائے کیا تھی (اضافۂ یا اور حرکتِ حرفِ اول کے متعلق):

" دیوان نہال چند کے یہاں تقریب میں.... غالب، جوالاسہائے سے.... ہم کلام تھے کہ لفظِ مِنار بالکسر ان کی زبان پر آیا۔ جوالاسہائے نے جو اس کا اعادہ کیا تو مینار کہا۔ غالب نے اس کی تصحیح کی۔ جوالاسہائے نشے میں تھا، متوجہ نہ ہوا۔ اور پھر یہ لفظ اسی طرح اس کی زبان پر آیا۔ غالب نے بآوازِ بلند کہا کہ منار بدونِ یا ہے۔ امین الدین اس وقت خاموش تھا۔ اب.... بولا کہ میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بیائے تحتانی غلط ہے اور میم مفتوح ہے۔ غالب قدرے تامل کے بعد بولے کہ ہاں صیغۂ ظرف ہے نور ہے، بالفتح چاہیے۔"

شعر غلط نامے کی تصحیح کے مطابق ملتے ہیں۔ ص ۱۰۱ پر ایک شعر اس طرح چھپا ہوا ملتا ہے:

سو جھے مضمونِ بیاضِ رُخِ جاناں جو مجھے ہوگیا رنگِ مرکّب رہم ارقام سفید

غلط نامے میں دوسرے مصرع کی تصحیح کی گئی ہے اور تصحیح کے مطابق دوسرے مصرع کی صحیح صورت یہ ہوگی: ہوگیا رنگِ مرکّب اسی ہنگام سفید

اس مصرع میں بھی بہ ظاہر اور کوئی عیب نہیں تھا، اس کے سوا کہ لفظِ ارقام نظم ہوا تھا، جو مینار کی طرح عربی کے لحاظ سے غلط ہے۔ عربی میں لکھنے کے معنی میں ارقام کوئی مصدر نہیں۔ غالباً اسی خیال سے اسے بدلا گیا ہے کہ یہ لفظ اصلاً غلط ہے۔ اس خیال کی تائیدیوں بھی ہوتی ہے کہ ص ۱۰۷ پر ایک اور شعر میں بھی یہ لفظ نظم ہوا تھا۔ شعر یہ ہے:

کیا منہ سے نیک و بد میں نکالوں کہ رات دن اخبار کوئی کرتے ہیں ارقام دوش پر

یہاں یہ لفظ قافیے میں اس طرح آیا ہے کہ اس کو آسانی کے ساتھ، مندرجۂ بالا شعر کی طرح، کسی ایک لفظ سے نہیں بدلا جا سکتا۔ غلط نامے میں "کوئی کرتے ہیں ارقام" کو

ل اُردو میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن لغت نویسوں نے اسے مشکوک الفاظ کی فہرست میں رکھا ہے۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے لکھا ہے:

"اگرچہ اُردو میں لکھنے کے معنوں میں مستعمل ہے مگر رقم سے بابِ افعال نہیں آیا۔ اس سبب سے اس کی صحت میں کلام ہے۔"

صاحبِ امیر اللغات نے لکھا ہے:

"ارقام۔ لکھنا۔ ارقام اردو میں ان معنوں میں مستعمل ہے۔ مگر عربی اور فارسی میں ترقیم ہی ہے۔ ارقام نہیں ہے۔ شمس اللغات اور فردوس اللغات کے سوا کسی مستند لغت میں نہیں دیکھا گیا، اس لیے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔"

غلط بتا کر، "لکھتے ہیں سحر و شام"، کو صحیح لکھا گیا ہے۔ اب مصرع یوں ہوا: اخبار لکھتے ہیں سحر و شام دوش پر۔ یہاں بھی ایک طرح سے پورا مصرع بدل دیا گیا ہے۔ یہ بھی ایسی تصحیح ہے جس کا حق مصنف کے سوا اور کسی کو نہیں پہنچتا۔ کلیات کی اشاعتِ ثانی میں دونوں شعر غلط نامے کے مطابق بہ تصحیح درج ہیں۔ لیکن نولکشوری اڈیشن میں یہ دونوں اشاعتِ اوّل ہی کے مطابق ہیں۔

ناسخ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ فارسی و عربی کے لفظوں کو صحت کے ساتھ نظم کیا کرتے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ کلامِ ناسخ میں ان لفظوں کا وجود مناسب نہیں تھا۔ اور غالباً اسی خیال سے یہ ترمیمیں کی گئی ہیں۔

مینار اور ارقام[1] کی طرح لفظِ جنات (جن کی جمع) بھی اردو میں اب مستعمل ہے۔ لیکن لغت کی رو سے یہ بھی صحیح نہیں۔ کلیات کے ص ۳۹۵ پر ایک شعر میں یہ ملتا ہے:

---

[1] لفظِ ارقام کے ذیل میں، ضمنی طور پر، ایک اور دل چسپ بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ امیر مینائی نے امیر اللغات میں، اردو میں لفظِ ارقام کے استعمال کی مثال میں، سودا کا ایک شعر اور ناسخ کا یہی آخری شعر درج کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یا تو غلط نامہ نہیں دیکھا یا اُسے قابلِ قبول نہیں سمجھا۔ کلیاتِ ناسخ کی اشاعتِ ثانی میں دونوں شعر جن میں ارقام آیا ہے، غلط نامے کے مطابق تصحیح کے ساتھ چھپے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ امیر کا ماخذ غالباً اشاعتِ ثانی ہے (اگر انھوں نے کہیں اور سے نقل نہیں کیا)۔ صاحبِ نور اللغات نے بھی لفظِ ارقام کے ذیل میں ناسخ کا یہی آخری شعر بہ طورِ مثال درج کیا ہے۔ صاحبِ نور اللغات کی یہ عادت ہے کہ وہ بغیر حوالہ، اسناد یا بیانات نقل کر لیا کرتے ہیں۔ یہاں بھی غالباً یہی ہوا ہے کہ انھوں نے کلیات کے بجائے، امیر اللغات سے اس شعر کو نقل کر لیا ہے

معیّن ہوں جنّات بہرِ حساب   مقرر ہوں انسان بہرِ کتاب

غلط نامے میں پہلے مصرع کی تصحیح اس طرح کی گئی ہے کہ "جنات بہر" کے بجائے "سب جن برائے" لکھا گیا ہے۔ اب مصرع اس طرح ہوا: معیّن ہوں سب جن برائے حساب۔

آصفیہ و نور اللغات کے مولفین نے بھی اس کی صراحت کر دی ہے کہ لفظِ جنّات بہ لحاظِ عربی غلط ہے۔ یہاں بھی وہی صورت ہے کہ ایک غلطی کو دور کرنے کے لیے ترمیم کی گئی ہے اور وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ناسخ سے جس صحت پسندی کو منسوب کیا گیا ہے، ان الفاظ کے وجود سے اُس پر حرف آتا تھا۔

اشاعتِ اوّل میں ص ۲۵۷ پر ایک غزل کے چار مطلع اس طرح درج ہیں:

ٹھوکر اک پائے حنائی سے لگایا چاہیے   پھول کوئی میری تربت پر چڑھایا چاہیے
باغ میں اس گل کو لے جا کر ہنسایا چاہیے   کھلیوں میں عندلیبوں کو اُڑایا چاہیے
اشک کوئی چشمِ مے گوں سے گرایا چاہیے   بادہ مجھ مے کش کی تربت پر چڑھایا چاہیے
پنجۂ گل گوں چمن کو اب دکھایا چاہیے   رشک سے مہندی کی ٹٹّی کو جلایا چاہیے

غلط نامے میں ہدایت کی گئی ہے کہ پہلے تین مطلعوں کے مصرع ہائے اول کو اس طرح پڑھنا چاہیے:

ٹھوکر اک پائے حنائی سے لگا کر گل رخو
باغ میں اس گل کو لے جا کر ہنسانا ہے ضرور
اشک کوئی چشمِ مے گوں سے گرا کر نشّے میں

چوتھے مصرع کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب اگر غلط نامے کے مطابق تصحیح کر لی جائے، تو غزل کے شروع میں تین شعر ہوں گے اور ان تین شعروں کے بعد مطلع آئے گا۔ یہ الٹی بات ہوئی۔ ان مصرعوں میں بہ ظاہر کوئی عیب نہیں تھا۔ اس کے سوا کہ رعایتوں کی ذرا کمی تھی۔ اب تصحیح کے بعد پہلے شعر میں پھول کی رعایت سے گل رخو آ گیا۔ تیسرے شعر میں مے کی

رعایت سے نشہ آگیا۔ پہلے صرف چشمِ مے گوں سے اشک گرایا گیا تھا۔ البتہ دوسرے شعر میں ایسی کسی رعایت کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ شاید یہ خیال کیا گیا ہو کہ پہلا اور تیسرا مطلع، یہ دونوں تو شعر میں تبدیل ہو گئے، بیچ میں ایک مطلع کیسے سمائے گا لہٰذا اسے بھی بدلنا ضرور ہوا۔ لیکن مطلع چوتھے نمبر پر آگیا، یہ بات شاید ذہن میں نہیں آئی ــــ بہ ہر صورت کہنا یہ ہے کہ مطلعوں کو، مصرعوں میں بدل دینا، تصحیح نہیں، ترمیم ہے۔ اور یہ صرف مصنف کا حق ہے ــــ ہاں، اشاعتِ ثانی میں یہ مطلع اشاعتِ اوّل کے مطابق ہی چھپے ہیں۔ غلط نامے کی تصحیح کو یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور یہ اہم بات ہے۔

نولکشوری نسخے میں غالباً اس قباحت سے بچنے کے لیے کہ شروع میں تین شعر ہوں اور مطلع چوتھے نمبر پر ہو، یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ چوتھے مطلع کو مطلع اوّل کے طور پر اور پہلے مطلع کو حسنِ مطلع کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اور باقی دونوں مطلعوں کو غلط نامے کی تصحیح کے مطابق درج کیا گیا ہے۔

ص ۳۷۹ پر مثنوی کے دو شعر یوں چھپے ہوئے ہیں:

نبی سے یہ جابر نے جس دم سُنا — تحیّر سے اللہ اکبر کہا
یہ کی عرض، اے سیّدِ انبیا — کہ تیرا چچا تھا ولیِ خدا!

غلط نامے کے مطابق پہلا شعر یوں صحیح ہوگا:

نبی سے یہ جابر نے جس دم سُنا — تو اللہ اکبر کی دے کر صدا

صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی ترمیم ہے۔ عیب کچھ نہیں تھا۔ پہلی صورت میں دونوں شعروں میں ربط ذرا کم تھا، دوسرے مصرع میں ترمیم کے بعد یہ کمی دور ہو گئی۔

ص ۳۹۲ پر ایک قطعۂ تاریخی کا پہلا شعر یوں چھپا ہوا ہے:

ربیع ثانی دو آز دہم — خوار قمر شد ہای افسوس

غلط نامے میں پہلے مصرع کو بالکل بدل دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق اب یہ شعر یوں ہوگا:

ماہِ چہارم یازدہم　　　خوارِ قرشد ہای افسوس

صاف ظاہر ہے کہ پہلے مصرع میں ایک عروضی سقم تھا۔ اس تبدیلی سے وہ رفع ہوگیا۔ کیا یہ کسی مصحح کا کام ہو سکتا ہے؟ اشاعتِ ثانی میں یہ غلط نامے کے مطابق چھپا ہے۔ لیکن نولکشوری نسخے میں غلط نامے کی تصحیح کے بغیر، اشاعتِ اوّل کے مطابق ہی چھپا ہے۔

ان مثالوں سے اس امر کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غلط نامے میں ایسی تصحیحات بھی موجود ہیں، جو درحقیقت ترمیمات ہیں۔ اور یہ سب یا تو کسی غلطی کو دور کرنے کے لیے یا خوب کو خوب تر بنانے کے لیے عمل میں آئی ہیں۔ اور یہ بھی کہ یہ ترمیمیں ایسی ہیں جن کو کوئی مصحح عمل میں نہیں لا سکتا۔ ایسی ترمیمیں صرف مصنف کر سکتا ہے یا وہ شخص جو مصنف کے بجائے ترمیم کرنے کو بھی اپنا حق سمجھتا ہو۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ جس نسخے یا مسودے سے کاتب نے کتابت کی ہے، اس میں یہ اشعار اسی طرح لکھے ہوئے تھے، جس طرح متن میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ناسخ کے پہلے دونوں دیوان، یعنی پہلا اور دوسرا دیوان، یہ دونوں ناسخ کی زندگی ہی میں مدوّن ہو چکے تھے۔ دوسرے دیوان کا تاریخی نام بھی ناسخ ہی کا رکھا ہوا ہے۔ ایک بات یہ بھی کہ کاتب کوئی غیر معروف کم سواد آدمی نہیں تھا، اُس عہد کے نہایت مشہور شخص نے اس کی کتابت کی ہے۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر اب صرف دو امکانات باقی رہتے ہیں: ایک تو یہ کہ رشک کے سامنے کوئی ایسی تحریر ہو، جس میں ناسخ کی ترمیمیں درج ہوں اور دونوں دواوین کے مسودے ان سے خالی ہوں۔ یا پھر یہ کہ یہ ترمیمیں خود رشک کی طبعِ صحت پسند کا کرشمہ ہیں۔

میں اس امکان سے انکار نہیں کرنا چاہتا کہ یہ ترمیمیں خود ناسخ کے فرمودات بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا کہ یہ بعد کے اضافے بھی ہو سکتے ہیں۔ رشک نے سرِ غلط نامہ کی عبارت میں صاف طور پر لکھا ہے کہ "تلمذ میں ناسخ کے سیکھا جو تھا" وہ

تحریر میں آشکارا ہوا۔ اب آپ اس سے جو چاہیں مطلب نکالیں۔ اگرچہ رشک نے اسی عبارت میں یہ بھی صراحت کر دی ہے کہ : ہوئیں سہوِ کاتب کی لفظیں درست :: بنا جو کہ نسیانِ املا ہوا۔ مجھے دخل اس سے زیادہ نہ تھا :: تبدّل میں جو کچھ ہویدا ہوا۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ صرف سہوِ کاتب کی درستی اور صرف نسیانِ املا تک بات محدود نہیں۔ اس لیے اس صراحت کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں۔ سعادت مند شاگرد اور عقیدت مند مرید کہتے ہی ہیں کہ یہ سب اُسی طرف کا فیضان ہے، لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے مختارات کو، استاد کے فیضان سے نسبت دے کر۔ ان میں رنگِ استناد اور رنگِ قبول کا اضافہ مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاگرد کی رائے میں اگر استاد سے کہیں سہو ہو گیا ہے، تو اس کی دلی خواہش یہ ضرور ہو گی کہ اس سے استاد کا دامن پاک رہے اور وہ اس سلسلے میں نیک نیتی کے ساتھ اپنے اس فریضۂ شاگردی کو ادا کرنے کا کوئی طریقہ نکال لے۔ یا جیسے مشہور روایت کے مطابق آزاد نے ذوق کے کلام میں جس حد تک بھی تصرف کیا ہو، اس کا تعلق کسی طرح کی بدنیتی سے نہیں ہوگا۔ استاد کے کلام کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعادت مندانہ آرزو اس کی محرک ہوئی ہوگی۔

اِس طرح کی اصلاحوں کی ایک اور دل چسپ مثال بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ مولوی عبدالسلام خاں صاحب رام پوری نے ایک مضمون میں اس کی نشان دہی کی ہے (مطبوعۂ معارف نمبر۲ ۔ جلد نمبر ۴۰): رام پور سے مصحفی کے کلام کا ایک انتخاب، غالباً نواب کلب علی خاں کے عہد میں اور "غالباً ان کے حسب الحکم" ۱۲۹۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس کی تصحیح و ترتیب امیرمینائی اور اُن کے استاد اسیر (شاگردِ مصحفی) نے کی تھی۔ تصحیح اس طرح کی گئی ہے کہ پورے پورے مصرعوں کو بدل دیا گیا ہے۔ جہاں کوئی متروک لفظ یا محاورہ تھا، اُسے بھی حالیہ زبان کے مطابق کر دیا گیا۔ ایک شعر سے اس "تصحیح" کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مصحفی کا شعر تھا:

اس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات — غنچے نے مُسکرا کے کہا، ہم نے پائی بات

غالباً اس خیال سے کہ "بات چلانا" اب فصیح نہیں، شاگرد نے اُستاد کے مصرع کو یوں بدل دیا:

پیکِ صبا نے اُس کے دہن کا کیا جو ذکر — غنچے نے مُسکرا کے کہا، ہم نے پائی بات

ایک اور شعر دیکھیے۔ مصحفی کا شعر تھا:

دل کو ہے رفتگی اُس ابروے خمدار کے ساتھ — جوں سپاہی کے تئیں ربط ہو تلوار کے ساتھ

اس شعر میں "رفتگی" اور "سپاہی کے تئیں" میں پرانا پن تھا۔ انتخاب میں اس کو یوں چھاپا گیا ہے:

دل کو یوں ربط ہے اُس ابروے خمدار کے ساتھ — عشق جس طرح سپاہی کو ہو تلوار کے ساتھ

فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ مصحفی کے دیوانِ دوم (مخزونہ رضا لائبریری رام پور) کے خطی نسخے پر جو اصلاحیں کی گئی ہیں، کہیں حاشیے میں اور کہیں متن میں، وہ امیرؔ مینائی کے قلم کی ہیں۔ اور مطبوعہ انتخاب کے ان اشعار کا متن (جو دیوانِ دوم سے ماخوذ ہیں) ان اصلاحوں کے مطابق ہے — جستجو کی جائے تو ایسے اور کارنامے بھی سامنے آسکتے ہیں۔ اس نشان دہی سے پہلے کون یقین کر سکتا تھا کہ اسیرؔ اور امیرؔ مینائی جیسے لوگوں نے استاد کے کلام کو اپنی اصلاحوں کے ساتھ پیش کیا ہوگا۔ یہ خیال رہے کہ امیرؔ مینائی اُردو کے معروف لغت نگار بھی ہیں

میں نے اس لیے اس طرف بہ طورِ خاص توجہ دلائی ہے کہ جب بھی کوئی شخص کلیاتِ ناسخ کو مرتب کرے (پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ہرگز نہیں۔ بلکہ واقعتہً کام کرنے کی نیت اور غرض سے)، اور اس کی بڑی ضرورت ہے، تو اس وقت اس مسئلے کو بہ طورِ خاص سامنے رکھے۔ دواوینِ ناسخ کے اہم خطی نسخے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں اور یہ اچھی خاصی تعداد میں ہیں، اس کا امکان ہے کہ ان کی مدد سے ان امور کا فیصلہ کیا جا سکے۔

اس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ یہ بات معلوم ہے کہ ناسخ کی مثنوی سراجِ نظم کو ناسخ کے مرنے کے بعد رشک نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ ناسخ کا تیسرا دیوان

بھی انھی کا مرتب کیا ہوا ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ تاریخی نام تو انھی کا رکھا ہوا ہے۔ کلیاتِ مطبوعہ کی تصحیح تو انھوں نے کی ہی ہے۔ اب بالفرض ہی سہی، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ ترمیمیں، یا کچھ اور ترمیمیں، ناسخ کے بجائے رشک کا کارنامہ ہیں، تو پھر صحتِ زبان سے متعلق اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ازسرِ نو جائزہ لینا پڑے گا۔ اس کی ایک بار پھر صراحت کر دوں کہ یہ سب امکانات ہیں۔ خطی نسخوں کے مطالعے اور مزید تحقیق کے بغیر کوئی واضح بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن میں اس پر زور دینا چاہتا ہوں کہ یہ امکانات بہت سے شک پیدا کرتے ہیں، اور بجا طور پہ پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی طرف خاص طور سے توجہ کی ضرورت ہے۔

اِس انتخاب سے متعلق

کلیاتِ ناسخ کا یہ انتخاب صرف غزلیات تک محدود ہے۔ رباعیاں اور مثنویاں بھی ناسخ نے لکھی ہیں، لیکن ان دونوں میں ان کا رنگ بہت پھیکا ہے۔ مثنویاں تو سراسر مذہبی معاملات سے تعلق رکھتی ہیں اور شاعری کے لحاظ سے سپاٹ ہیں۔ ان میں رنگِ ناسخ کی جھلک بھی نہیں پائی جاتی۔ غزلیات ہی ان کے کمال کی جلوہ گاہ ہیں۔

کلامِ ناسخ کا ایک حصّہ آج اپنی ساری دل کشی کھو چکا ہے۔ اس میں جو مضامین نظم کیے گئے ہیں اور جس طرح نظم کیے گئے ہیں، وہ آج دل کشی کیا دل چسپی کی ادنا جھلک سے بھی محروم ہیں۔ ان کی حیثیت سراسر تاریخی ہے، میوزیم کی اشیا کی طرح۔ ہاں ایک حصّہ ایسا ضرور ہے جس میں ناسخ کی صنّاعی معراجِ کمال پر ہے اور اُس صنّاعی میں آج بھی دل کشی کی چمک اور دل چسپی کی مقناطیسیت اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ کلام کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے جس میں سادگی نمایاں ہے۔ اس میں بھی ایک گوارا کیفیت نظر آجاتی ہے کوشش کی گئی ہے کہ ایسے سارے اشعار کو شاملِ انتخاب کر لیا جائے۔

یہ ایک ایسے شخص کا کلام ہے جس نے پورے عہد کو متاثر کیا تھا۔ جس کا گھر شاعری کی ٹکسال تھا اور جس کا اسلوب اُس عہد کا نمایندہ اور معیاری اسلوب تھا۔ جو لوگ دہلی میں بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی اس شخصیت اور اس آواز سے متاثر تھے۔ جادو اسی کو کہتے ہیں اور طلسمات اسی کا نام ہے۔ اعجاز کے مقابلے میں آدمی جادو پر جلدی ایمان لے آتا ہے۔ لیکن جادو پھر جادو ہے، جب چلتا ہے، تو پھر اس کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔ طلسم خواہ ہوش رُبا جیسا ہو، اس کی مدّت متعین ہوتی ہے اور محدود۔ بہ ہر حال، ناسخ کی ساحری مسلّم ہے اور اُن پر ایمان لانے والوں کا گروہ بہت سے پیغمبروں کی پوری اُمّت سے زیادہ ہوگا۔ یہ شرف بھی کسے ملتا ہے۔

رشید حسن خاں
شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی دہلی

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا — روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا
بیعت خدا سے مجھ کو ہے بے واسطہ نصیب — دستِ خدا، ہے نام مرے دست گیر کا
انگشتر اپنی دے کے سلیماںؑ کر دیا — طاعت میں بھی سوال سنا گر فقیر کا
جس کو کیا نشانہ، ہوا دم میں بے نشاں — ہر تیر، ہے شہ پرِ ملک الموت، تیر کا
اہلِ نفاق کفرِ خفی کرتے کیا نہاں — تھا علم بابِ علم کو مافی الضمیر کا
یارب! حصارِ امن میں رکھیو مجھے مدام — مداح ہوں ازل سے شہِ قلعہ گیر کا

ناسخ کا ادعا ہے یہی روزِ باز پرس
میں ہوں غلام، شاہِ رسل کے وزیر کا

مرا سینہ، ہے مشرقِ آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر، چاک ہے میرے گریباں کا

ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دلِ پر داغ کو کیوں کر ہے عشق اُس زلفِ پیچاں کا

کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے، غبار اپنے بیاباں کا

شگفتہ مثلِ گُل ہر فصلِ گُل میں داغ ہوتے ہیں
بنا ہے کیا ہمارا کالبد خاکِ گلستاں کا!

شفق سمجھا ہے اُس کو ایک عالم، وائے بے دردی!
فلک کو گر بگولا جا لگا خاکِ شہیداں کا

سبب خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے
کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے، صحرائے قیامت، جس کے داماں کا

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابرِ باراں میں
تصور چاہیے رونے میں اُس کے روئے خنداں کا

دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اُس پری رُو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

مرا ویرانہ مثلِ آئنہ معمورِ حیرت ہے
یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا

جو سُرخی آتی ہے عکسِ شفق سے بھی مرے مُنہ پر
حسد سے رنگ ہوتا ہے مُبدّل چرخِ گرداں کا

کسی سے دل نہ اِس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا
نہ اُلجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشّاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

جس جگہ ہے حُسن، فوراً قدرداں پیدا ہوا
چاہ میں یوسف گرا، تو کارواں پیدا ہوا

جب نہ تھا تجھ پر یہ عالم، تھی یہی تو بھی حیا
باغ کی خلقت سے اوّل باغباں پیدا ہوا

رشک سے میرے سخن پر خلق ہوتی ہے ہلاک
حیف، دنیا میں نہ کیوں بے زباں پیدا ہوا

وادیِ ہستی میں آتے ہی، عدم کی راہ لی
ساتھ اپنے توسنِ عمرِ رواں پیدا ہوا

گُل فشاں عکس ہوا کس کے رُخِ رنگیں کا
ہے جو آئینے میں عالم سبدِ گُل چیں کا

مانگی باراں کی جو ہم بادہ پرستوں نے دُعا
رعد نے سنتے ہی اک نعرہ کیا آمیں کا

فرقتِ یار میں کیا ہوش اُڑے جاتے ہیں
شبہ پرِ خواب ہے، جو پَر ہے مرے بالیں کا

آج ہوتا ہے دِلا، درد جو میٹھا میٹھا
دھیان آیا ہے تجھے کس کے لبِ شیریں کا

اشتیاقِ گلِ خورشید، شبِ ہجر میں ہے
کیا فلک مجھ کو دکھاتا ہے چمن نسریں کا

شعرِ تر جو ہے مرا، اک گُلِ تر ہے ناسخ
نہیں قرطاس، یہ دامن ہے کسی گُل چیں کا

مہندی سے ہے شعلہ، قدم اُس رشکِ پری کا
یا پوٹ نے سیکھا ہے چلن کبکِ دری کا

پاکانِ ازل کو نہیں پروائے مُربّی
عیسیٰ کو ضرر کچھ نہ ہوا بے پدری کا

نکلے جو ہوادار پہ وہ برقِ تجلّی
کیوں کر نہ ہو عالم کو گُماں تختِ پری کا

پُر رعب زمیں کوچۂ قاتل کی ہے ایسی
ٹھہرے نہ جہاں نقشِ قدم رہ گذری کا

دیوان میں سادی ہی جگہ چھوڑ دی میں نے
مضمون یہ باندھا تری نازک کمری کا

پیری میں کسے زیست کی امید ہے ناسخ
ناداں! کوئی جھونکا ہے نسیمِ سحری کا

زلف سے کیجیو شانے کو نہ زنہار جدا
کاٹ کھاتا ہے، جو ہوتا ہے سرِ مار، جدا

لوں جو بوسہ، نہ لبوں سے ہوں لبِ یار جدا
ہے وہ بلبل ہی، جو غنچوں سے ہو منقار جدا

سرِ عشاق یہاں بکتے ہیں معشوق وہاں
کوے قاتل ہے جدا، مصر کا بازار جدا

آدمی آدمی ہے، اور ہے حیواں حیواں
تیری رفتار جدا، کبک کی رفتار جدا

نام رکعت ہے کہیں، لغزشِ مستانہ کہیں
نہیں شغلِ حرم و خانہ، تمھارا جدا

عیش ہے عاریت اس باغ میں، اور رنج مدام
کیا ہوں گُل بن سے بھلا گُل کی روش، خار جدا

سروساماں پہ ہے کیا کبر، کہ غافل! اک دن
جسم سے سر ہے جدا، سر سے ہے دستار جدا

تخلیہ چاہیے، جس وقت میسر ہو وصال
قبر میں رکھتے ہی، کیوں کر نہ ہوں غم خوار جدا

گُل چلے جاتے ہیں، تو کہتے ہیں برگِ گُل بن
ہم تہی دستوں سے کیوں کر نہ ہوں زردار جدا

فصل کیوں کر کروں دونوں میں گوارا تیغ!
کہ محمدؐ سے نہیں حیدرِ کرار جدا

خلق کی تسخیر کو، ہر نقشِ پا، افسوں ہوا
سایہ دیکھا اُس پری کا جس نے، وہ مجنوں ہوا

اِس ادا سے دھوئے ہیں دستِ حنائی آپ نے
ہر حبابِ آبجو، اک دیدۂ پُر خوں ہوا

ہم شہیدوں کی جو خاک اس کی سواری سے اُڑی
ایک دم میں توسنِ بادِ صبا، گُل گوں ہوا

طوق ہالے کا پڑا اس کے گلے میں کس لیے
چاند بھی شاید اُسی کے عشق میں مجنوں ہوا

ساتھ زر کے پستیِ ہمت بھی ہوتی ہے زیاد
ورنہ مائل سوے اسفل کس لیے قاروں ہوا

مے کدے میں ہے مزے پر انقلابِ روزگار
جامِ مے سیدھا ہوا، شیشہ اگر وارُوں ہوا

بیتِ ابرو میں اسیر ایسا ہوا، چھوٹا نہ پھر
طائرِ دل بھی ہمارا طائرِ مضموں ہوا

اپنے ابرو آئنے میں دیکھ کر بسمل ہوا
کھینچ کر تلوار، اپنا آپ وہ قاتل ہوا

اِس ادا سے بارھا دیکھی آپ نے تلوار کی
طائرِ رنگِ حنا بھی، طائرِ بسمل ہوا

بجھ گیا میرا چراغِ داغ، وصلِ یار میں
نورِ مہ، نزدیکیٔ خورشید سے زائل ہوا
جب تصور یار کا باندھا، ہم آپ آئے نظر
سامنے آنکھوں کے آئینہ ہمارا دل ہوا
روحِ ناسخ ہے اُسی کی روحِ اقدس پر نثار
بارہا جس کے لیے روح القدس نازل ہوا

روے جاناں کا تصور میں جو نظارا ہوا
دل میں تھا جو داغِ حسرت، عرش کا تارا ہوا
وہ مہِ خانہ نشیں، گلیوں میں آوارا ہوا
اے منجم، دیکھنا! ثابت بھی سیّارا ہوا
کس قدر ہے تیز ظالم آتشِ رنگِ حنا
سنگِ پا لگتے ہی بس تلووں سے انگارا ہوا
جو خیالِ وحشت تیری آنکھوں پر یہ خوش چشموں کو ہے
مثلِ آہوِ وحشت میں ہر ایک آوارا ہوا
چین سے سویا نہ دنیا میں کبھی جز خوابِ مرگ
بعد مرنے کے، جنازہ مجھ کو گہوارا ہوا
زاہدا ہم جانتے ہیں، عشق بازی ہے گناہ
گھر لٹایا ہے جو وحشت میں، وہ کفارا ہوا
دوستو، جلدی خبر لینا، کہیں ناسخ نہ ہو
قتل آج اُس کی گلی میں کوئی بے چارا ہوا

آگیا مجھ کو جو اُس زلفِ پریشاں کا خیال
دم میں مجموعہ عناصر کا پریشاں ہوگیا

تنگیٔ محفل کی دولت بھڑکے بیٹھا مجھ سے یار
رات اہلِ بزم کی کثرت کا احساں ہوگیا

چاند چھپتا ہے جو دو دن، ہوتی ہے مشتاق خلق
ہوگئی قدر اُس کی جو نظروں سے پنہاں ہوگیا

پانو بھی اب اے جنوں کر دیجیے کانٹوں کی نذر
سر تو مدت سے نیازِ سنگِ طفلاں ہوگیا

سر اُٹھا کر جو چلا اِس دشتِ وحشت خیز میں
پار تلووں سے وہیں خارِ مغیلاں ہوگیا

شمعیں کافوری جلاتے تھے، سو اُن کی گور پر
دیدۂ غولِ بیاباں سے چراغاں ہوگیا

کوئی دم پیری بھی اپنی ہے بسانِ صبح دم
مثلِ شب عہدِ شباب آنکھوں سے پنہاں ہوگیا

کیا کہیں مرگِ احبا میں جو ہم کو غم ہوا
گر مُوا دشمن کوئی، اُس کا بھی اک ماتم ہوا

خاک ساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر، سر بلند
آسماں پیشِ زمیں بہرِ تواضع خم ہوا

ہوگیا گورِ غریباں میں عیاں حالِ جہاں
کاسۂ سر جو نظر آیا وہ جامِ جم ہوا

تا بہارِ عارضِ گُل رنگ تھی سب شاعری
اب وہ دفتر مثلِ اوراقِ خزاں برہم ہوا

آدمی ہیں، آدمی تم، کیوں نہ ہو باہم ملاپ
حرف کو دیکھو کہ کیا ہم جنس سے مدغم ہوا

زندگی چشمِ جہاں میں خوار رکھتی ہے دلا!
دوش پر سب نے لیا جب آدمی بے دم ہوا

کیا اثر میری سیہ بختی کے آگے نور کا
ماہ ہے اک خال، رخسارِ شبِ دیجور کا

پاس ہوں یاروں کے جب تک، مجھ کو گنتے ہیں بزرگ
خُرد آتا ہے نظر انساں کو انساں دور کا

مجھ سے اوّل خانۂ زنداں میں تھا مجنوں، تو کیا
گھر محل میں پہلے ہوتا ہے گزر مزدور کا

تیرہ بختی، موذیوں پر کرتی ہے نازل بلا
شہد لُٹتا ہے شبِ تاریک میں زنبور کا

دعویِ باطل سے ہو جاتے ہیں اکثر نامور
شہرہ کیا بانگِ اَنَا الْحَق نے کیا منصور کا

بارِ غم سے سایۂ گیسو میں ہے دل کو فراغ
شام کر دیتی ہے چھٹکارا ہر اک مزدور کا

کوئے قاتل میں پہنچ کر، سر ہوا مجھ کو وبال
بوجھ اُترنے کی جگہ، دم چڑھ گیا مزدور کا

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

روئے جاناں پہ ہوا خطِ معنبر پیدا
ہو گئے حُسن کی پرواز کو شہ پر پیدا

سعی سے گوہرِ مقصد نہیں ہوتا حاصل
نہ کبھی آبِ رواں میں ہوئے گوہر پیدا

حرفِ سخت اُس نے کہے مجھ کو لبِ رنگیں سے
جائے حیرت ہے، ہوئے لعل سے پتھر پیدا

کیا ہی ہے خاک کے پُتلوں کی سنہری رنگت
کبھی اکسیر سے ایسا نہ ہوا زر پیدا

ہے ازل سے وہ مرا قبلۂ ایماں ناسخ
جس کو خالق نے کیا کعبے کے اندر پیدا

اُس پہ آفت نہیں، مُنہ سوئے خدا ہے جس کا
طائرِ قبلہ نما کا ہے کو بسمل ہو گا

غافلو! نشۂ دولت سے نہ اتنا بہکو
دیکھنا، کاسۂ سر، کاسۂ سائل ہو گا

اُنس ہے تجھ کو عبث لالہ رخوں سے ناسخ
داغِ حسرت کے سوا خاک نہ حاصل ہو گا

کوئی غارت گر نہیں دیوانوں کے اسباب کا
خانۂ زنجیر کو کچھ غم نہیں سیلاب کا

ساقیا! لا جامِ مے در پیش ہے جنگِ سخن
ہے بجا تیغِ زباں پر آج ہونا آب کا

پاک طینت جو کہ ہیں، اُن سے تعلق دور ہے
خار سے کیا اُلجھے گوشہ چادرِ مہتاب کا

ہے یہی خورشید کا رُتبہ حضورِ روئے یار
سامنے خورشید کے رُتبہ جو ہے مہتاب کا

جورِ اعدا پر بھی کر سکتا نہیں ترکِ وطن
دھیان آتا ہے جو ناسخ فرقتِ احباب کا

پھر قیامت زا ہوا ہلنا لبِ خاموش کا
پھر نظر آنے لگا موسم جنوں کے جوش کا

لگ گئی ہے پھر جوانِ روز دوں میں جھپکی سی مجھے
آ گیا ہے دھیان پھر اک کافرِ خاموش کا

پھر پڑا رہتا ہوں میں بے ہوش بدمستوں کی طرح
پھر تصور بندھ گیا مجھ کو کسی مے نوش کا

پھر ہوا ضبطِ فغاں دشوار اے ناسخ مجھے
پھر قیامت زا ہوا ہلنا لبِ خاموش کا

دل سے لوں گا میں کام رہبر کا
کیا پتا چاہیے ترے گھر کا

ہے شبِ ہجر، تا ابد نہیں صبح
نہ رہا خوف روزِ محشر کا

ہجر میں چاندنی سے کیا خوش ہوں
طَور ہے تُربتوں کی چادر کا

نہیں آغازِ خط اُس رشکِ گُل کے روئے رنگیں پر
دلا! یہ برگِ گُل پر عکس ہے مژگانِ بلبل کا

ہر ہر قدم پہ پھوٹتے جاتے ہیں آبلے
نقشِ قدم میں طَور ہے چشمِ پُر آب کا

کہتے ہیں تیرے عارض و قامت کو دیکھ کر
بالائے سرو پھول کھلا ہے گلاب کا

ہر صبح وہی صبح ہے، ہر شام وہی شام
انسان پہ ہے زور فقط انقلاب کا

مشکل بغیرِ ساقیِ مہ وش ہے دورِ مے
محتاج آفتاب ہوا ماہتاب کا

اُس کی نگاہِ گرم جو پڑتی ہے غیر پر
ابلیس اب نشانہ ہے تیرِ شہاب کا

پیری بغیر ہم نے نہ دیکھا طلوعِ صبح
گزرا شبِ فراق میں موسم شباب کا

لب ریز اُس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا
بنتا ہے عکسِ رُخ سے، کٹورا گلاب کا

رکھتا ہے چرخ اَوج کسی کا کب ایک دن
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا

جوہر ہیں برگِ گُل ترے چہرے کے عکس سے
بن جائے کیوں نہ آئنہ، تختہ گلاب کا

صُبحِ فراق میں ہوئی قدرِ شبِ وصال
آیا ہے یاد پیری میں عالم شباب کا

ناصح! شراب پی، شبِ تاریک ہے تو کیا
محتاج آفتاب نہیں ماہ تاب کا

گُل نہیں جُز داغِ حسرت بوستانِ دہر میں
طَور ہر برگِ شجر میں ہے کفِ افسوس کا

ہجر میں نالے ہیں ہونٹھوں پہ گریباں ہاتھ میں — وصل میں کام اِن سے لیتے تھے کنار و بوس کا
مدتیں گزریں کہ قدموں سے جُدا ہوتے نہیں — کس قدر ہے شوق کانٹوں کو مرے پابوس کا

پریوں کو عمل سے میں تسخیر نہیں کرتا — جُز نقشِ درم، کچھ بھی تاثیر نہیں کرتا
کیوں کر مرے رونے سے، دل نرم ہو اُس بُت کا — پتّھر میں کبھی پانی تاثیر نہیں کرتا
کیوں فکرِ عمارت ہے دنیا میں تجھے ناسخ — ویرانے میں گھر کوئی تعمیر نہیں کرتا

دل میں ساکن ہے خیال اک بُتِ بے پروا کا — آشیانہ مرے ویرانے میں ہے عنقا کا
کیوں طلیں عالمِ بالا سے نہ مضمونِ بلند — ہے درِ فکر خیال اُس کے قدِ بالا کا

سُلیمانی ہے زیبا اُس پری کو مُلکِ خوبی میں
تبسّم، نقشِ خاتم ہے۔ دہن، حلقہ ہے خاتم کا
نہیں ہے معتقد میرا اگر حاسد، تو کیا غم ہے
ہُوا بے سجدۂ ابلیس کیا نقصان آدم کا
سخاوت جس کو کہتے ہیں، کہانی ہے زمانے میں
بخیلوں کی بدولت رہ گیا ہے نام حاتم کا
مری آنکھوں میں پڑ جائیں نہ کیوں کر اس قدر حلقے
تصوّر رات دن رہتا ہے تیری زلفِ پُرخم کا
تماشا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کنجِ عزلت میں
ہمارے بوریا کا نقش، خط ہے ساغرِ جم کا
گزر ناگاہ جو میرا ہوا شہرِ خموشاں میں
عجب نقشا نظر آیا وہاں شاہانِ عالم کا

کہیں آئینۂ زانوئے سکندر کا شکستہ تھا
کسی جانب پڑا تھا کاسۂ سر خاک میں جم کا
محب ہیں سایۂ رہ، اور عدو ہیں خارِ رہ ناسخ
مسافر وادیِ امکاں میں ہوں گویا کوئی دم کا

عشق کر دیتا ہے سلطان و گدا کا ایک رنگ
کوہ کن کی طرح خون آخر کیا پرویز کا
مانعِ رفتار مجھ وحشی کو ہوں کیا خارِ دشت
تیز رَو کرنا فرس کو، کام ہے مہمیز کا
اشک گر پڑتے ہیں، دل ہوتا ہے جس دم بے قرار
میری آنکھوں میں ہے عالم ساغرِ لبریز کا
جوششِ مضموں کو، خامہ، صورِ اسرافیل ہے
یاں زمینِ شعر میں عالم ہے رستاخیز کا
عشق کے آزار میں مرتا ہے، پر ہے گرِ دیار
ہے خُدا حافظ دلِ بیمارِ بے پرہیز کا
گامِ اوّل ہی جہاں پڑتا ہے چاہِ گور میں
ناسخ آوارہ ہے اُس صحرائے آفت خیز کا

سیکڑوں آہیں کروں، پر ذکر کیا آواز کا
تیر جو آواز دے، ہے نقص تیر انداز کا
نازنینوں سے کروں کیا ربط میں نازک مزاج
بوجھ اُٹھ سکتا نہیں مجھ سے کسی کے ناز کا
یار سے کرتا ہوں میں باتیں، جلے جاتے ہیں غیر
صاعقہ اُن کو ہوا شعلہ مری آواز کا

رات ایسا انتظارِ یار میں بے تاب تھا
بسترِ گُل پر نہ تھا میں، آگ پر سیماب تھا
تیرے روئے آتشیں کو دیکھتے ہی اُڑ گیا
اضطرابِ دل جسے سمجھے تھے ہم سیماب تھا
گُل کہیں دیکھا نہ میں نے، داغِ حسرت کے سوا
میرے اشکوں سے مگر باغِ جہاں شاداب تھا

یاں آسرا ہے ساقیِ کوثر کی ذات کا
ہے ساغرِ شراب، سفینہ نجات کا

زخمِ دہانِ خلق کو ہے اِس سے اِلتیام
مرہم سے ہے زیادہ اثر میری بات کا

جیتے ہیں سوزِ عشق سے مانندِ شمع ہم
رُتبہ ملا ہے آگ کو آبِ حیات کا

وقفہ نہیں کہ غنچۂ منقار کھل سکے
ہوں عندلیب کس چمنِ بے ثبات کا

جب تک وہ ہے دوچار، مری زندگی بھی ہے
تارِ نگاہِ یار ہے رشتہ حیات کا

کھینچ لائی وادیِ ہستی میں بے تابی مجھے
رہ گیا پیچھے عدم میں قافلہ آرام کا

اے فلک دیکھوں تو کب تک روزِ وصل آتا نہیں
منتظر بیٹھا ہوں میں بھی گردشِ ایام کا

دے دُپٹا تو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں، کفن بھی ہو ہلکا

کہتے ہیں سالکانِ منزلِ عشق
ہے نشاں گور، گامِ اوّل کا

جُز صنم کچھ نظر نہیں آتا
وہ مُوحِدّ ہوں روزِ اوّل کا

سر پہ پہاڑ اُٹھ کے نہ اے آسماں گرا
جو برگِ گل کو سمجھیں کہ سنگِ گراں گرا

ساقی کے ہاتھ سے جو گرا شیشۂ شراب
سمجھا ہیں بادہ کش کہ خُمِ آسماں گرا

آزاد ہیں قیود سے اُفتادگانِ خاک
اُڑتا پھرا، شجر سے جو برگِ خزاں گرا

پامال جو کرے گا مجھے، پائے گا سزا
شیشے کی طرح خاک پہ میں ناتواں گرا

لغزش رہِ سلوک میں اُفتادوں کو ہو کیا
ٹھوکر نہ کھا کے ایک دن آبِ رواں گرا

ہے وہ دل ویراں نہیں جس میں فروزاں داغِ عشق
روشنی یعنی نشاں ہے خانۂ آباد کا

فصلِ گُل آنے نہیں پائی کہ تو یاد آگیا
اے جنوں دیوانہ ہوں میں اپنے دل کی یاد کا

آج دعوا اس کی یکتائی کا باطل ہوگیا
بحث کرنے کو جو آئینہ مقابل ہوگیا

ایک دل لے کر، دیے قاتل نے مجھ کو لاکھ دل
جو لگا پیکاں مرے پہلو میں، وہ دل ہوگیا

کچھ بھی حاصل باکمالوں کو نہیں ہے جز زوال
موردِ نقصاں ہوا، جب ماہ کامل ہوگیا

صبح ہوتے کچھ نظر آیا نہ غیر از آفتاب
کون کون اک رات کو یاں شمعِ محفل ہوگیا

رات بھر جو سامنے آنکھوں کے وہ مہ پارہ تھا
غیرتِ مہتاب اپنا دامنِ نظّارہ تھا

تو نے آنکھیں پھیر لیں، یاں کام آخر ہوگیا
طائرِ جاں، پائے بندِ رشتۂ نظّارہ تھا

شب ترے پرتو سے لبریزِ لطافت تھا چمن
ہر گلِ شبّو سے جاری نور کا فوّارہ تھا

مجھ کو دم لینے کی بھی فرصت نہ دنیا میں ملی
روزِ مولد شادیانہ، کوچ کا نقّارہ تھا

خرّمی ہوتی ہے بے دردوں کو سیرِ باغ میں
ہم نے جس گل پر نظر کی، اک دلِ صد پارہ تھا

اے اجل، دی تو نے بارِ جسم سے آکر نجات
کب سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا پشتارہ تھا

خوف سب جاتا رہا دل سے عذابِ ہجر کا
نقدِ جاں دینا، گناہِ عشق کا کفّارہ تھا

کہتے ہیں، مارا گیا بے جرم تیغِ ناز سے
کوچۂ قاتل میں ناسخؔ نام جو بے چارہ تھا

وصل کیا ہم خاکساروں کو ہو اُس دل خواہ کا
خاک میں آلودہ ہونا کب ہے ممکن ماہ کا

جا برابر ہے دلِ مادر میں ہر فرزند کی
رُتبہ زیرِ خاک یکساں ہے گدا و شاہ کا

سوالِ وصل میں ہلنا، پری رو! تیرے ابرو کا
اشارہ ہے، براتِ عاشقاں برشاخِ آہو کا
اگر لب سُرخ ہیں، تو نشّے سے آنکھیں بھی گل گوں ہیں
بُتوں نے کر دیا ہے ایک رنگ اعجاز و جادو کا

دوائرِ حرفوں کے بنتے ہیں طوقِ گردنِ قمری
رقم کرتا ہوں گر مضمون اپنے سروِ دل جو کا
مزہ جو ہے، وہ گویا اک زباں کا کام کرتی ہے
یہ عالم ہم نے دیکھا ہے کسی چشمِ سخن گو کا

زندگی کا کوئی دم مجھ کو مزہ مل جاتا
میرے زخموں پہ جو قاتل نمک افشاں ہوتا

ہوگیا دامنِ تر، نورِ حقیقت کو حجاب
کس طرح ابر میں خورشید نہ پنہاں ہوتا

پونچھتا اشک، اگر گوشۂ داماں ہوتا
چاک کرتا میں جنوں میں، جو گریباں ہوتا

مال ملتا جو فلک سے، ضررِ جاں ہوتا
سر نہ ہوتا، جو میسر مجھے ساماں ہوتا

نکہتِ کاکلِ پیچاں سے جو دیتے تشبیہ
عطرِ مجموعہ کا ہر جزو پریشاں ہوتا

کی مکافات شبِ وصل خدا نے، ورنہ
کس لیے مجھ پہ عذابِ شبِ ہجراں ہوتا

اپنی صورت کا وہ دیوانہ نہ ہوتا تو کیوں
پانو میں سلسلۂ گیسوِ پیچاں ہوتا

اے اجل! ایک دن آخر تجھے آنا ہے، ولے
آج آتی شبِ فرقت میں، تو احساں ہوتا

کیا قوی ہے یہ دلیل اُس کی پری زادی کی
ربط انسان سے کرتا، جو وہ انساں ہوتا

اے بتو! ہوتی اگر مہر و محبت تم میں
کوئی کافر بھی نہ واللہ مسلماں ہوتا

ترے رخسار کا مضموں جو اے جانِ جہاں باندھا
تو گویا ہم نے اک گل دستۂ باغِ جناں باندھا
دمِ فکرِ سخن اکثر ہماری طبعِ روشن نے
تجھے خورشید باندھا اور زمیں کو آسماں باندھا

معطر اُس کے نہانے سے بس کہ آب ہوا
حبابِ بحر ہر اک، شیشۂ گلاب ہوا

جو یادِ بزم میں آئی وہ نرگسِ مے گوں
نظر میں ساغرِ مے، دیدۂ پُر آب ہوا

نجات ہو گی عذابِ حساب سے سب کو
جو پہلے روزِ قیامت مرا حساب ہوا

نگہ ٹھہرتی نہیں اپنے عکس پر اُس کی
شعاعِ حُسن سے آئینہ آفتاب ہوا

خلل پذیر ہمیشہ ہے کارخانۂ عقل
کبھی نہ خانۂ زنجیر، یاں خراب ہوا

بُو کبھی کافر کی زلفوں سے جُدا ہوتی نہیں
طائرِ نکہت بھی قیدی ہو گیا اِس جال کا

طوق ہر گرداب ہے، ہر موج ہے زنجیرِ پا
ہے ہر اک آبِ رواں دیوانہ تیری چال کا

عالمِ حیرت ہوا عالم، دکھا اپنا جمال
منتظر آئینہ خانہ ہے تری تمثال کا

پھر نہ میرے پاس آیا جا کے اے جانِ جہاں
طور کیا سیکھا ہے تو عمرِ رواں کی چال کا

جس پہ تو مرتا ہے برسوں سے، وہ ہر دم اور ہے
دم بہ دم ناسخ، تجدُّد ہے یہاں امثال کا

آدمی کو عشق نازیبا ہے زلف و خال کا
جانور ہوتا ہے قیدی دانے کا اور جال کا

جب سے نظروں میں سمائی ہے کمر ایذا میں ہوں
رنج دیتا ہے بہت آنکھوں میں پڑنا بال کا

بیٹھے ہیں عُشاق ہو کر تیری آنکھوں پر فقیر
ورنہ کیوں بستر ہے تکیوں میں ہرن کی کھال کا

طُرفہ گُل اِس باغ میں ہیں، اور شبنم ہے عجب
ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں، وہ رو کر اُٹھا

ہو صفائے دل کے آگے خاک آئینے کی قدر
میری محفل سے مکدّر ہو کے اسکندر اُٹھا

دشمنِ سر ہے تری گردن کشی مانندِ شمع
افسرِ زر شوق سے رکھ، پر نہ اتنا سر اُٹھا
بات جن نازک مزاجوں سے نہ اُٹھتی تھی کبھی
بوجھ اُن سے سیکڑوں من خاک کا کیوں کر اُٹھا
کیا سخن سنجی سے حاصل جب سخن داں ہی نہیں
زانوِ فکرت سے اے ناسخ تو اپنا سر اُٹھا

نکتہ چیں جُنتا ہے تنکے، دیکھ کر دیواں مرا
نقشِ افسوں گر، ہر اک پتا ہے اِس گُل زار کا
مانعِ صحرا نوردی، پانو کی ایذا نہیں
دل دُکھا دیتا ہے میرا، ٹوٹ جانا خار کا

پہنچے ہم آتش زبانوں کو ضرر دشمن سے کیا
شمع کو کرتا ہے روشن ترستم گُل گیر کا
کون عالم کے مُرقّع میں ہے مجھ سا بے ثبات
رنگ اُڑ جاتا ہے کھنچتے ہی مری تصویر کا
کیا ہے کبرِ مُدّعی، میری تواضع کے حضور
سرکشی دم میں مٹا دیتا ہے خم شمشیر کا
ہے دلیلِ مرگِ انساں، واقعی موے سفید
کوہ کن کی موت تھی، انجام جوے شیر کا
اِس خرابے میں، بنایا جس نے گھر، دیوانہ ہے
دیکھ ہر دروازے پہ ناسخ نشاں زنجیر کا

ملاقاتِ دو روزہ کو یہاں آئے تھے ہم لیکن
سرائے دہر کو سب نے مقامِ جنگ ٹھہرایا
اجل سے ہو کے غافل، جن کو ہے دعوائے سلطانی
تو گویا تختۂ تابوت کو اورنگ ٹھہرایا
کدورت اپنے چہروں کی نظر آتی ہے لوگوں کو
تماشا ہے کہ اُلٹے، آئنے میں زنگ ٹھہرایا

آگے کشتِ آرزو کے آبرو میری رہی
برق ہی گرتی جو میں بارانِ رحمت مانگتا

ہے یقیں، زہرِ ہلاہل مجھ کو دیتے آشنا
گر میں حالِ نزع میں بھی جامِ شربت مانگتا

غیرِ حسرت لے گیا یاں سے کوئی کیا اپنے ساتھ
آسماں سے کس توقع پر میں دولت مانگتا

یہ لفظِ گُل تو رسمِ خط میں نقطے سے معرّا ہے
گلِ رخسار پر خالق نے کیوں نقطہ دیا تِل کا

ملے گا رزقِ تقدیری، کرو، تدبیر کیا ناسخؔ
وہ ہرزہ ہے، ارادہ جو کرے تحصیلِ حاصل کا

لبِ ساقی کے بوسوں کی گزک ہو گر نہ اے ناسخؔ
شرابِ زندگی میں ہے مزہ زہرِ ہلاہل کا

خاکِ صحرا چھانتا پھرتا ہوں اس غربال میں
آبلوں میں کر دیے کانٹوں نے روزن زیرِ پا

سرو دیکھیں گے جو اُس سروِ خراماں کا خرام
پھر نہ ٹھہرے گی زمینِ صحنِ گلشن زیرِ پا

اِس عمارت کو نہ تو سر پہ اٹھا لے جائے گا
دیکھ اے غافل ذرا، تیرا ہے مسکن زیرِ پا

ہوئی جو صبحِ شبِ وصل، جان ڈوب گئی
قضا نے چشمۂ خورشید میں ہلاک کیا

آنکھیں نرگس، چہرہ گُل، گیسو ہیں سُنبل، سرو قد
عکس سے آئینہ خانہ صاف گلشن ہو گیا

موت نے تیغِ زبانِ خلق سے دی ہے نجات
کہتے ہیں جس کو کفن، وہ مجھ کو جوشن ہو گیا

گر قناعت ہو، تو نانِ خشک ہے نعمت، دلا!
دیکھ لے، پانی، چراغِ گُل کو روغن ہو گیا

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

خارِ غم میں نے جو پنہاں ہی رکھے ساری عمر
میری تُربت سے ہوئے نخلِ مغیلاں پیدا

گر نہیں ہے وہ پری، کیوں ہے بھبھوکا ایسا
کہ خدا نے تو کیے خاک سے انساں پیدا

ہم ضعیفوں کو کہاں آمد و شد کی طاقت
آنکھ کی بند، ہوا کوچۂ جاناں پیدا

سنگِ کہسار، برائے سرِ شوریدہ بنے
ہوئے پاؤں کے لیے خارِ مغیلاں پیدا

ہوں میں بیمار، گیا غیر کے دل کا دھڑکا
کی مرے درد نے خاصیتِ درماں پیدا

اس طرح خاک سے وہ چہرۂ پُر نور بنا
ظلمتِ شب سے ہو جیسے مہِ تاباں پیدا

بدلے تاروں کے، اسی چاند کو دیکھا میں نے
آنکھ کھلتے ہی ہوا جلوۂ جاناں پیدا

دل جو مجروح ہوا، پائے یہ رنگیں مضموں
نخلِ گُل ہو جو قلم، گُل ہوں دو چنداں پیدا

روزِ مولد سے نہیں عیش و طرب قسمت میں
رمز یہ ہے جو بشر ہوتے ہیں گریاں پیدا

آدمی پر ہے تعلق کو جہاں میں سبقت
بعد کانٹوں کے ہوا گوشۂ داماں پیدا

تار ہیں سجدۂ معبود میں، ناسخ مصروف
سر سے اس واسطے ہوتے ہیں سب انساں پیدا

تری ہی رہ گذر میں گبر و مومن کرتے ہیں سجدے
ترے نقشِ قدم سے ہو گئے دیر و حرم پیدا

عیاں ہے ہر حبابِ بحر سے کیفیتِ دُنیا
برائے چشمِ بینا، ہیں ہزاروں جامِ جم پیدا

مری آتش زبانی ہے خراب اس دورِ آخر میں
کیا اِس شمع کو بزمِ جہاں میں صبح دم پیدا

کیا کرتا ہے گردوں بے نشاں بنیادِ ظالم کو
کہیں ہوتا نہیں شدّاد کا باغِ ارم پیدا

نہیں ممکن کہ کلکِ فکر لکھّے شعر سب اچھے
برستا ہے بہت نیساں، گُہر ہوتے ہیں کم پیدا
کجی روزِ ازل سے طینتِ موذی میں داخل ہے
کیا خالق نے ساتھ انھی کے، ناسخ! پیچ و خم پیدا

لے چلی موت مجھے سوئے حسینانِ بہشت   ایک دم پاس جو وہ حور شمائل نہ ہوا
بارِ احسانِ فلک سے تو ملی آزادی   یہ بھی حاصل ہے، اگر کچھ مجھے حاصل نہ ہوا

تو نہیں ملتا تو ہم بھی تجھ سے اب ملتے نہیں
سنگ دل! ہم نے بھی اپنے دل کو اب پتھر کیا

پہنچے کیا گوشہ نشینوں کو ضرر دشمن سے   آتشِ سنگ کو کچھ خوف نہیں پانی کا
کس کے کوچے میں جبیں سا تو ہوا ہے ناسخ   چاند سا، داغ ہے روشن تری پیشانی کا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں   سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

روزِ روشن، تیرہ بختی سے نہ دیکھا عمر بھر
شب کی شب گویا میں اِس محفل میں مہماں رہ گیا
حسرتِ پابوسِ قاتل دل سے نکلی وقتِ قتل
تیغ کا، ناسخ، مرے سر پر یہ احساں رہ گیا

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا، وہ ایک نافہ ہے مشکِ چیں کا

زبس کہ وصفِ دہانِ شیریں، رہا ہے وردِ زبانِ شیریں
بدن میں جب تک ہے جانِ شیریں، مزہ دہن میں ہے انگبیں کا

وہ چشمِ فتاں ہے غیرتِ مُل، وہ زلفِ پیچاں ہے رشکِ سُنبل
عذار میں ہے شباہتِ گُل، بدن میں عالم ہے یاسمیں کا

زبس کہ ہے جوشِ داغِ ہجراں، ہوا مرا سینہ باغِ رضواں
برائے گل گشت، جائے غلماں، خیال پھرتا ہے اک حسیں کا

یہ اس کے ہے ساعدوں کا عالم، کہ جس نے دیکھے، ہوا وہ بے دم
نیامِ تیغِ قضائے مُبرم، لقب ہے قاتل کی آستیں کا

بُرا ہو بدبخت عاشقی کا، نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا
بنا ہے عشقِ بُتاں میں ٹیکا، نشانِ سجدہ مری جبیں کا

طمع ہے انصافِ دوستاں سے، کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے، بلند تر رُتبہ اس زمیں کا

جو دل ہی ٹوٹ گیا، کیا ہوں شعرِ تر پیدا ہوئے ہیں شاخِ شکستہ سے کب ثمر پیدا
شگفتہ غنچہ نہ جب تک ہو، بُو نہیں آتی ہو چاک چاک اگر دل، تو ہو اثر پیدا
جو ہیں حسین وہ مفلس کبھی نہیں رہتے گلوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے دیکھو زر پیدا
نہ داغِ یاس سے گھبرا، بر آئے گی اُمید گلوں کے بعد ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا
پناہ ملتی ہے خلقت کو مرگِ ظالم سے جو کرگدن کو کریں قتل، ہو سپر پیدا
ستارۂ سحری ہے اگر ترا دُرِ گوش ہوئی ہے تیری بنا گوش سے سحر پیدا

اے شبِ غم اب نہیں اس کے سوا تدبیرِ خواب
چھٹ کے قیدِ زیست سے، کرتے ہیں ہم تسخیرِ خواب

عالمِ اسباب میں، اسبابِ غفلت ہیں عزیز
خلق کی آنکھوں میں جا ہے، دیکھنا توقیرِ خواب

بعدِ مدّت خواب میں آیا جو وہ، میں چونک اُٹھا
یہ گناہِ بختِ خوابیدہ ہے اور تقصیرِ خواب

گر مسیحا کو نہیں میری عیادت کا خیال
پڑ گئی ہے کیا اجل کے پانو میں زنجیرِ خواب

میں نے خوابِ وصل کو اُس سے کیا ہے جب بیاں
اُس نے اُلٹی ہی سنائی ہے مجھے تعبیرِ خواب

مَے کشی سے زاہدوں کو اِس لیے انکار ہے
تا نہ اِن بد باطنوں کے کھول دے جوہر شراب

ہیں جو عالی ہمت، اُن کو مے کشی سے عشق ہے
آدمی کی عرش پروازی کو ہے شہ پر شراب

داستانِ صیاد و گُل چیں کی فقط رہ جائے گی
ہے ثباتِ گُل ہمیشہ، نہ بقائے عندلیب

عارضِ جاناں کے ہوتے، گُل پہ کیوں عاشق ہوئی
ہوگئی صیاد پر ثابت خطائے عندلیب

جامِ مَے لب ریز ہیں ساقی، فقط مطرب نہیں
گُل کھلے ہیں باغ میں، خالی ہے جائے عندلیب

راز پوشی کاش ہم کو بھی سکھائے عندلیب
نام شبنم کا ہو اور آنسو بہائے عندلیب

طوطیاں محوِ تکلم، کبک پامالِ خرام
آفتِ قمری ہے قامت، رُخ بلائے عندلیب

اپنے دل سا جانتا ہوں غیر کے دل کا بھی حال
سوئے گُل دیکھوں نہ ہرگز بے رضائے عندلیب

جانتی ہے شاخِ گل، صیاد، تیرے ہاتھ کو
خود بخود کیوں تیرے قابو میں نہ آئے عندلیب

دیکھ کر گل کو، حقارت سے وہ گُل کہنے لگا
بس یہی ہے شاہدِ رنگیں قبا سے عندلیب!

بعدِ مُردن اُڑتے پھرتے ہیں چمن میں بال و پر
عشقِ گل میں، دیکھ اے ناسخ، وفائے عندلیب

لوٹتے ہیں خاک میں، آنکھیں لگی ہیں سوئے بام
مرتے ہیں معراج پر اُفتادگانِ کوئے دوست

وصفِ جنت جب کیے واعظ نے منبر پر شروع
صاف میں سمجھا کہ کرتا ہے بیانِ کوئے دوست

کب ہے کعبے کا ادب ایسا کہ رکھتے ہی قدم
پانو اپنے چومتے ہیں رتبہ دانِ کوئے دوست

جو وہاں پہنچا، وہی آگاہ اُس عالم سے ہے
اور ہی کچھ ہے زمین و آسمانِ کوئے دوست

تن پروری کے شغل میں کھوتا ہے جاں عبث،
فکرِ مکیں ضرور ہے، فکرِ مکاں عبث

یہ رمز ہے کہ جائے سکونت جہاں نہیں
گردش میں کب ہے آٹھ پہر آسماں عبث

سُنتا ہے کون قلقلِ مینا کے شور میں
ہر سمت مسجدوں میں ہے شورِ اذاں عبث

صد برگ سے ترا دلِ صد چاک کم نہیں
ناسخ! تجھے ہوئی ہوسِ بوستاں عبث

یاں کسی خورشید رو کے عشق میں
ہوتی ہے ہر رات سو سو بار صبح

اُس صنم پر توڑ کر تارِ شعاع
اب گلے میں ڈالے گی زنار، صبح

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں
ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح

ہے یہاں کس کو شبِ فرقت میں ہوش
ہو چکی ہوگی ہزاروں بار صبح

ہے نازکی سے قامتِ جاناں سمن کی شاخ
میں سوزِ عشق سے ہوں چنارِ کہن کی شاخ

ظالم کو بعدِ مرگ بھی ہے ظالموں سے ربط
خنجر کا دستہ کیوں نہ بنے کرگدن کی شاخ

ہم وحشیوں کے بخت، جو برگشتہ ہیں سو ہیں
سیدھی کسی طرح نہ ہو جیسے ہرن کی شاخ

دیکھے جو یہ چنبیلی کی کلیوں سی انگلیاں
وہ تیرے دستِ دیا کو کہے یاسمن کی شاخ

معنی ثمر، حروف ورق، صنعتیں ہیں گل
ناسخ! ہے کلکِ فکر، نہالِ سخن کی شاخ

ہے بہ رنگِ گل سراپا وہ بتِ خوں خوار سرخ
کیوں نہ ہو جائے رگِ گل کی روش زنار سرخ
کل خدا جانے سیہ رو کون ہوگا زاہدا
آج تو مانندِ گل ہے روئے ہر مے خوار سرخ

سرخ پوش آئے نظر شوخ، یہ ہے رنگِ بدن
پہنے پوشاک جو وہ سروِ گل اندام سفید

غرہ کر حسنِ دو روزہ پہ نہ اے سیم اندام
رنگ سب رنگوں میں ہوتا ہے بہت خام سفید

نہیں ہے سبزۂ خطِ عارضِ محبوبِ پرفن پر
ہوئے ہیں جمع پروانے یہ آ کر شمعِ روشن پر

خبر ہے جان و تن کی صیدگاہِ عشق میں کس کو
جگر ہے محو ناوک پر، نظر ہے ناوک افگن پر

جہاں میں تیرہ دل جو ہیں وہی بے رنج رہتے ہیں
کہ نازل ہوتی ہے آفت ہوا کی شمعِ روشن پر

ہوا ہوں صدمۂ بیداریِ شب ہائے ہجراں سے
کبھی سبزہ بھی خوابیدہ نہ ہوگا میرے مدفن پر

کسی کا درد ہوتا ہے کسی کو کب زمانے میں
کہ جام و گل ہیں خنداں شیشہ و بلبل کے شیون پر

اگر ہوتا ہے اک دانہ بھی اس میں میری قسمت کا
فلک بجلی گرا دیتا ہے ناسخ میرے خرمن پر

کیا روزِ بد میں ساتھ رہے کوئی ہم نشیں
پتّے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

جیتے جی جاؤں میں کیوں کر کوئے جاناں چھوڑ کر
بُلبُلِ نالاں کہاں جائے گلستاں چھوڑ کر

کاوشِ غم دور ہو میرے دلِ ویراں سے کیا
خار جاتے ہیں کوئی صحرا کا داماں چھوڑ کر

ہو وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر
لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

ہوتی ہے غربت میں ثروت پر بڑی ایذا کے بعد
رنج اُٹھائے کس قدر یوسف نے کنعاں چھوڑ کر

سر پٹکتی پھرتی ہیں ارواح سنگ و خشت سے
چل بسے ہیں جسم کیا کیا قصر و ایواں چھوڑ کر

اعتبار اصلا نہیں، گر ہے جہاں زیرِ نگیں
اُٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیماں چھوڑ کر

زاہدا کیوں کروں میں ترک، یہ دُنیا وہ ہے
سیر کو آئے تھے آدم، باغِ رضواں چھوڑ کر

مر گیا کیا ناسخِ مے کش، جو سارے مے فروش
مسجدوں میں بیٹھے اپنی اپنی دُکاں چھوڑ کر

پاسِ حرم نہ چاہیے اے پنجۂ جنوں
بارِ گراں ہے جامۂ احرام دوش پر

تعمیر پر جو مرتے ہیں نافہم، یہ مگر
لے جائیں گے اُٹھا کے در و بام دوش پر؟

شیریں کوئی نہیں ہے، مگر کوہ کن کی طرح
تیشہ لیے کھڑا ہوں میں ناکام دوش پر

دیکھا ہے ہم نے خوب نشیب و فرازِ دہر
آنسو زمیں پر ہیں، تو آہ آسمان پر

میری زمینِ شعر کا دیکھے جو مرتبہ
تحقیر سے کرے وہ نگاہ آسمان پر

زنداں میں بھی کوچہ ترا اے یار آتا ہے نظر
بُلبُل قفس میں ہے، مگر گلزار آتا ہے نظر

تھا دم جو جسمِ یار میں، ہے دیدۂ خوں بار میں
جینا فراقِ یار میں دشوار آتا ہے نظر

ناسخ، ہے اب آٹھوں پہر، مشقِ تصوّر اس قدر
جس سمت کرتا ہوں نظر، دلدار آتا ہے نظر

موذیوں کو خانماں برباد کرتا ہے فلک
جب نہ تب آتی ہے آفت خانۂ زنبور پر

کی خدا نے کافروں پر اے صنم جنت حرام
ورنہ کس کی آنکھ پڑتی تیرے ہوتے، حور پر

رنج اٹھائے ہیں حسینوں سے جہاں میں اس قدر
بعدِ مُردن بھی نہ آنکھ اپنی پڑے گی حور پر

جذبۂ عاشق، کمندِ جلوۂ معشوق ہے
قبل موسیٰ کے ہوئی تھی کب تجلی طور پر

خاک کا پُشتارہ دوشِ روح سے اُترے کہیں
یا الٰہی! ہے وبال اب بوجھ اس مزدور پر

پاک ہے جو حُسن، وہ محتاج پردے کا نہیں
حاجتِ فانوس تھی نا نسخ، نہ شمعِ طور پر

تیرِ مژگاں بھی غضب تھے، پر کیا ابرو نے قہر
[illegible] گئے لاکھوں، جو نوبت آ گئی تلوار پر

بے ارادہ طے ہوئی جاتی ہے یاں راہِ عدم
طائرِ روحِ رواں کو کچھ نہیں درکار پر

لختِ دل سینے سے دوڑے آتے ہیں سوئے مژہ
دیکھو اعجازِ محبت، گُل ہیں عاشق خار پر

ایسے ہم روئے، رہا پرواز سے مُرغِ نگاہ
بھیگنے سے طائروں کے ہوتے ہیں بے کار پر

گُل ہیں خوش خُلقی سے مقبولِ نظر اے تند خو
باغِ عالم میں نظر پڑتی ہے کس کی خار پر

عازمِ گُل گشت وہ مے کش ہے کیا، جو آسماں
تانتا ہے شامیانہ ابر کا گُلزار پر

کوئے جاناں میں ہوں، پر محروم ہوں دیدار سے
پائے خفتہ خندہ زن ہیں دیدۂ بیدار پر

زلف کے صدمے زیادہ رُخ سے ہیں مجھ زار پر
دن سے افزوں رات بھاری ہوتی ہے بیمار پر

ناتوانوں کے الم سے، اہلِ غفلت کو ہے عیش
خوش ہوئے سب، ناخنِ مطرب لگا جب تار پر

شب جو اُٹھی اس نے روئے حیرت افزا سے نقاب
چاندنی، مثلِ سفیدی رہ گئی دیوار پر

عاشق کے دل کے حال سے ہے کس کو اطلاع
باطن میں پُر شرر ہے، بہ ظاہر چنار سبز

ہیں گُل عذار ماہِ محرّم میں سبز پوش ‏ ‏ ‏ گویا کہ پھول سُرخ ہیں اور شاخسار سبز
ٹھوکر لگے جو توسنِ بادِ بہار کی ‏ ‏ ‏ مانندِ برگ، سنگ سے نکلیں شرار سبز

لگتی ہیں مینائے گردوں کو ہزاروں ٹھوکریں
کرتے ہیں مستی میں جب ہم رندِ مَے آشام رقص
ہوگیا پیری میں عیش اپنا جوانی سے دوچند
ہاتھ میں رعشے سے کرتا ہے جو مَے کا جام رقص
تو ہے وہ صیاد ظالم کہ تجھ کو دیکھ کر
کرتے ہیں بدلے تڑپنے کے، اسیرِ دام رقص

کیوں کر اُس کے آنسوؤں کا تار ٹوٹے ایک دم ‏ ‏ ‏ کہتی ہے میرا زبانِ حال سے افسانہ، شمع
وصل کے معنی یہ ہیں، ہوں عاشق و معشوق ایک ‏ ‏ ‏ شمع سے ملتے ہی، بنتے ہیں پر پروانہ، شمع

ایسی تاریکی ہے، گم ہوتا ہے نورِ آفتاب
کب ہے ممکن، کر سکے روشن مرا کاشانہ شمع
کیا نزاکت ہے کہ جھنجھلا کر لگا کہنے وہ رات
محفلِ عشرت کو کر دیتی ہے آتش خانہ، شمع
تیری پابوسی کی حسرت میں جلے گی عمر بھر
گنتی ہے فانوس کو محفل میں زنداں خانہ شمع

گر کے بجلی نے، نکالی ہے مری حسرت یہ آج ‏ ‏ ‏ سچ تو ہے، کرتی کہاں روشن مرا کاشانہ شمع

بیٹھتے دیکھا نہیں ہر گز کسی نے ایک دم
گنتی ہے اِس بزم کو ایسا مسافر خانہ شمع
سر پہ سوزاں داغِ سودا، پانوں میں زنجیرِ اشک
تیری محفل میں کھڑی ہے صورتِ دیوانہ شمع

روشن اُس کے سینۂ پُر نور سے ہوتی ہے بزم
نور میں یکساں ہے وہ آئینۂ بے رنگ و شمع
داغِ سوزاں اس پہ آفت، شعلہ ہے اُس پر وبال
شعلہ رو! یکساں ہے تیرا عاشقِ بے ننگ و شمع
شعلہ رُخسارانِ سنگیں دل سے تھا جو ہم کو اُنس
بعدِ مردن بھی ہمارے سینے پر ہے سنگ و شمع
حُسنِ یوسف سے ہوئی پُر نور ایسی راہِ مصر
روشنی میں تھا برابر میلِ ہر فرسنگ و شمع
گیسوئے شب رنگ و خطِ سبز دردِ آتشیں
ہے شبِ تاریک اور فانوسِ مینا رنگ و شمع

جلتا ہوں سر سے پانو تلک مثلِ آفتاب
حاصل ہوا نہ مجھ کو فلک سے سوائے داغ

جوشِ وحشت نے کیا ایسا مجھے آتش قدم
خانۂ زنجیر میں ہونے لگے روشن چراغ
روشنی ایسی ہے اُس کے سینۂ پُر نور کی
ہو گیا مجھ کو یقیں، ہے زیرِ پیراہن چراغ
ہیں جو روشن طبع، بغض اُن سے سیہ کاروں کو ہے
چور کو جس طرح آتا ہے نظر دشمن چراغ
کوئی پروانہ جلے گا، تو جلوں گا غم سے میں
دوستو ہر گز نہ تم رکھنا سرِ مدفن چراغ
داغِ حسرت جل اُٹھا گُل گشت میں تیرے بغیر
آتشِ رنگِ چمن سے ہو گیا روشن چراغ
پھونک مارے غنچۂ لب سے اگر وہ رشکِ گُل
بزم میں پھیلائے بجھ کر نکہتِ گلشن، چراغ

وصل میں بھی ہائے جس دل کو نہ ہوتا تھا قرار
اے فلک، تو نے کیا اُس کو گرفتارِ فراق!

کیا اسیری میں کریں شکوہ ترا صیاد ہم
واں بھی کچھ دامِ رگِ گُل سے نہ تھے آزاد ہم

یہ زمیں ہے بے وفا، یہ آسماں بے مہر ہے
جی میں ہے اک اب نیا عالم کریں ایجاد ہم

روک لے اک بات کی بات اپنے دست و تیغ کو
دے لیں اے قاتل، رقیبوں کو مبارکباد ہم

قیدِ ہستی تک ہیں تیرے دامِ گیسو میں اسیر
تن سے سر آزاد ہو جائے، تو ہوں آزاد ہم

جب سے دیکھی ہے گلِ رخسارِ جاناں کی بہار
ہو رہے ہیں صورتِ برگِ خزاں برباد ہم

پہلے اپنے عہد سے افسوس، سودا اٹھ گیا
کس سے مانگیں جا کے ناسخ اس غزل کی داد ہم

عینِ غفلت میں ہیں مثلِ نرگسِ بیمار ہم
دیکھنے کو اپنی آنکھیں رکھتے ہیں بیدار ہم

نقدِ دل دیتے ہیں اک محبوبِ بازاری کو آج
زورِ سودا مول لیتے ہیں سرِ بازار ہم

کیوں جنازے کو اٹھا کر سب نے شرمندہ کیا
ایک کے دل پر نہ جیتے جی ہوئے تھے بار ہم

بادشاہی کر رہے ہیں انزواے فقر میں
پائے خفتہ کو کہیں اب طالعِ بیدار ہم

عمر گزری، اک بتِ کافر نظر آیا نہیں
حشر میں کیوں کر خدا کا پائیں گے دیدار ہم

دل سبک وضعوں سے اپنا آشنا ہوتا نہیں
سنگِ مقناطیس، ہرگز کہربا ہوتا نہیں

خط کو روئے یار پر نشوونما ہوتا نہیں
سبزۂ بیگانہ، گل سے آشنا ہوتا نہیں

تو بھی آغوشِ تصور سے جدا ہوتا نہیں
اے صنم، جس طرح دور اک دم خدا ہوتا نہیں

فقر سے ایسی مری خاطر کو ہے پیچیدگی
محو اعضا سے نشانِ بوریا ہوتا نہیں

نشۂ عرفاں نہیں جب تک، دلا ہے قیل و قال
تا نہ ہو لبریز ساغر، بے صدا ہوتا نہیں

موذیوں کو روندتے پھرتے ہیں ہم وحشت میں بھی
کب سرِ خارِ مغیلاں زیرِ پا ہوتا نہیں

بحرِ وحدت میں ہوں میں گو سر گیا مثلِ حباب
چوب کیا تلوار سے پانی جدا ہوتا نہیں

تیرے دیوانے ہیں معشوقانِ عالم اے پری
کون گل ہے جس کا پیراہن قبا ہوتا نہیں

باغِ عالم میں بہ رنگِ سبزۂ بیگانہ ہوں
غیرِ پامالی، کوئی یاں آشنا ہوتا نہیں

دیکھے ہیں ہنسنے میں جس دن سے دُرِ دندانِ یار — چین، مثلِ گوہرِ غلطاں، کسی پہلو نہیں
ہو گیا ہے یہ قرانِ آفتاب و ماہِ نو — یار کے رُخسارِ آتش رنگ پر ابرو نہیں
رات دن ناقوس کہتے ہیں بہ آوازِ بلند — دَیر سے بہتر ہے کعبہ، گر بُتوں میں تو نہیں
قمریاں دیوانی ہیں، کیوں کر گلے میں ہو نہ طوق — باغ میں اک سرو مثلِ قامتِ دل جو نہیں

زور ہے گرمیِ بازار ترے کوچے میں — جمع ہیں تیرے خریدار ترے کوچے میں
دَیر ویراں ہیں ترے عہد میں کعبہ ہے خراب — جمع ہیں کافر و دیں دار ترے کوچے میں
زور ہی عشق نے یہ تفرقہ پردازی کا — ہم ہیں زنداں میں، دلِ زار ترے کوچے میں
گر یہی ہیں ترے ابرو کے اشارے، قاتل — آج، کل چلتی ہے تلوار ترے کوچے میں

گھر جو بے یار ہے ویراں، تو تصور میں مدام — خانۂ دل کو ہم آباد کیا کرتے ہیں
رشک سے لیتے نہیں نام کہ سُن لے نہ کوئی — دل ہی دل میں اُسے ہم یاد کیا کرتے ہیں
انتقام اُس کا کہیں لے نہ فلک، ڈرتا ہوں — جھوٹے وعدوں سے جو وہ شاد کیا کرتے ہیں
تیرا دیوان ہے کیا سامنے اُن کے ناسخ — جو کہ قُرآن پہ ایراد کیا کرتے ہیں

ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں — جی نہ آبادی میں لگتا ہے نہ ویرانے میں
ہوں وہ مے کش کہ نہ مستی میں کہوں راز کبھی — لاکھ قُل قُل کہے شیشہ مجھے مے خانے میں

عشق میں دل نے پھنسایا تو ہوا غیر کو رنج
نہیں اپنے میں مروّت، جو ہے بے گانے میں

خونِ کفک سے، رنگِ رگِ گل ہے خار میں — پُرزے بہ رنگِ گل ہے گریباں بہار میں

پہنچا وہ جب کہ دور میں پہنچا قریبِ مرگ
عمرِ رواں کے طور ہیں رفتارِ یار میں
اوراقِ گُل، رگوں سے جو مسطر کشیدہ ہیں
رنگیں غزل اک اور لکھوں میں بہار میں

آلودگی سے دہر میں بچنا محال ہے
خوں کافروں کے لگتے رہے ذوالفقار میں
جو ہیں مآل بیں، گُلِ صد برگ کی طرح
اُن کو پسند رنگِ خزاں ہے بہار میں
بارود میں لگادے کوئی آگ جس طرح
کرتے ہی عشق، دل نہ رہا اختیار میں
مانندِ برگِ گُل، نہ ہو شعلے میں روشنی
روشن کروں جو شمع شبِ ہجرِ یار میں

تڑپا کروں گا حشر تلک میں مزار میں
یا رب، نہ موت آئے مجھے ہجرِ یار میں
اُس سرو قد کا دستِ حنائی ہے شعلہ زن
یا آگ لگ رہی ہے یہ برگِ چنار میں
گر آنکھ ہے تو باطنِ انساں کی دید کر
کیا کیا طلسم دفن ہیں مُشتِ غبار میں

سر رگڑوں آستانِ بُتِ نازنیں سے میں
ہے جی میں، داغِ سجدہ مٹاؤں جبیں سے میں
کافی ہے سر پہ داغِ جنوں، دل میں نامِ یار
بے زار ہوں فلک ترے تاجِ زریں سے میں
ہے اُنس چینِ گیسوئے مشکیں سے جس قدر
رکھتا ہوں نفرت اتنی ہی چینِ جبیں سے میں
ناسخ! نہ ہو جیو مگسِ خوانِ اغنیا
سنتا ہوں یہ سخن لبِ نانِ جویں سے میں

بھرا رہتا ہے خونِ دل ہمیشہ دیدۂ تر میں
شراب اِس کے عوض کب ہو گی ساقی اپنے ساغر میں

ہمارے دل میں رہتا ہے تصور تیری آنکھوں کا
کِھلے ہیں پھول نرگس کے، یہاں شاخِ صنوبر میں

نہیں ہیں یہ صنم بھولے، جو چُپکے بُت سے بیٹھے ہیں
چھپی ہے یوں شرارت، ہوں شرارے جیسے پتھر میں

زباں دانتوں تلے دابی جو اُس نے یہ نظر آیا
کہ ہے اک پارۂ یاقوت بھی اِس سلکِ گوہر میں

یاں ازل سے داغِ سودا ہے دلِ آگاہ میں
سنگِ اسود جس طرح ہو نصب بیت اللہ میں

حُسنِ جاناں ایک عالم پر رہے، ممکن نہیں
یاں کمی بیشی رہا کرتی ہے نورِ ماہ میں

ہوں تری تاثیر کا قائل، جو اے مضمونِ شوق
یار کو مکتوب پہنچے، نامہ بر ہو راہ میں

بعدِ مُردن اِس کو راحت، اُس کو ہے حسرت نصیب
فرق اِتنا ہی نظر آیا گدا و شاہ میں

خوش عبث ہوتے ہیں ناداں ماہِ نو کو دیکھ کر
اک مہینا عُمر کا ہوتا ہے کم ہر ماہ میں

سر بُتوں کے آستانے سے نہ اُٹھے حشر تک
یہ دُعا ناسخ کی ہے یارب، تری درگاہ میں

بے سبب، کیوں کر کہوں، ہر گُل ہے خنداں باغ میں
کچھ تو دیکھا ہے، جو یوں نرگس ہے حیراں باغ میں

جوشش رونے کا ہوا ہے، کوے جاناں کو چلیں
آتی ہے برسات تو جاتے ہیں انساں باغ میں

رنگِ عشرت کر گیا پرواز باغِ دہر سے
مجھ کو حیرانی ہے، گل کیوں کر ہیں خنداں باغ میں

ہاتھ آئے ہیں جو تجھ سے داغِ عشق اے رشکِ گل
نخلِ گل ہیں، صورتِ طاؤس رقصاں باغ میں

نکہتِ زلفِ صنم کے سونگھنے والے ہیں ہم
بوئے گل سے ہو دماغ اپنا پریشاں باغ میں

واں ہزاروں ہیں گریباں چاک، یاں گل بے شمار
مجھ کو یاد آتا ہے ناسخ، کوئے جاناں باغ میں

نہیں ممکن خُمِ گردوں میں ٹھہرنا میرا
مستیٔ عشق سے وہ بادۂ سرجوش ہوں میں

ہمہ تن وصفِ سراپائے صنم میں ہوں زباں
ایک وصفِ دہنِ تنگ میں خاموش ہوں میں

یار آتا ہے عیادت کو، نہ تو آتی ہے
تیری خاطر سے بھی اے موت، فراموش ہوں میں

تمام صفحۂ عالم ہے ایک ہی صفحہ
سرِ کتاب کا یہ اک ورق تمام نہیں

محال پیری میں ہے لطف نوجوانی کا
چراغِ صبح میں نورِ چراغِ شام نہیں

زمانہ محو ہوا، دل جو ہے کسی پر محو
مرے نگینے میں ناسخ، کسی کا نام نہیں

چمکتا ہے سنہرا رنگ ایسا اُس پری رو کا
کہ ہے جُزوِ بدن سونے کا تعویذ اُس کے بازو میں

ترا کوچہ وہ گلشن ہے کہ جب اُس کا خیال آیا
زیادہ ہو گئے سب داغِ دل پھولوں سے خوش بو میں

جو میزانِ خرد ہو، ہیں برابر اسفل و اعلا
ہمیشہ سنگ و زر ہم وزن ہے دیکھو ترازو میں

دکھایا کہکشاں میں جلوۂ قوسِ قزح ہم کو
کئی رنگوں کے جب تعویذ باندھے اُس نے بازو میں

عوض افسوں کے، جادو گر مرے اشعار پڑھتے ہیں
کہ وقتِ فکر، دل رہتا ہے اس کی چشمِ جادو میں

کبھی ہے دھیان عارض کا، کبھی یادِ مژہ دل کو
کبھی ہیں خار پہلو میں، کبھی گل زار پہلو میں

کسی میں زر، کسی میں سنگ، یہ ہے پھیر قسمت کا
برابر گرچہ ناسخ دونوں پلّے ہیں ترازو میں

ہزاروں قتل ہوتے ہیں، مگر یہ آب داری ہے
کہ لگتا ہی نہیں ہرگز لہو شمشیرِ ابرو میں

ترے بس میں جو مجھ کو دیکھتا ہے، رو کے کہتا ہے
کوئی انساں نہ آجائے کسی انساں کے قابو میں

تری آنکھیں نہیں، یہ دونوں پلّے ہیں ترازو کے
ہمیشہ نیک و بد کو تول ناسخ، اس ترازو میں

خامشی مجھ کو ہوئی قفلِ دہن اِن روزوں — چھُٹ گیا مشغلۂ شعر و سخن ان روزوں
گُم ہوئی ہے مری گُل بانگ سے راہِ منقار — کیوں نہ ہوں گرمِ فغاں زاغ و زغن ان روزوں
ناتوانی نے کیا مُردہ مجھے جیتے جی — پیرہن تن پہ ہے مانندِ کفن ان روزوں

ہیں جفائیں جو یہی اہلِ وطن کی ناسخ
مجھ سے چھُٹتا نظر آتا ہے وطن ان روزوں

مُو، ہیں جوہر، ایک تیغِ ابروِ خم دار میں
ورنہ وہ بے کار رہے، ہو بال جس تلوار میں

جو حسیں ہے، گھر میں اس کا بیٹھنا ممکن نہیں
ماہِ کنعاں کو پھرایا حُسن نے بازار میں

آفتابِ حشر پر ہے انتقام اِس کا، جو ہم
چَین کرتے ہیں کسی کے سایۂ دیوار میں

ایسے لکھ رنگیں مضامیں، ناسخِ نازک خیال
یک قلم اوراقِ گُل ہوں دفترِ اشعار میں

دیکھ لے جوڑا بسنتی جب وہ جسمِ یار میں
پھولے کیوں سرسوں نہ چشمِ نرگسِ بیمار میں

لختِ دل غم نے پروئے آنسوؤں کے تار میں
دانۂ یاقوت بھی ہیں موتیوں کے ہار میں

کیا عجب تارِ کفن بن جائیں گر تارِ نگاہ
جان نکلی ہے بدن سے حسرتِ دیدار میں

مار ڈالا بات میں، ٹھوکر سے زندہ کر دیا
سحر ہے گفتار میں، اعجاز ہے رفتار میں

رسمِ ملکِ حُسن یہ ہے، گُل فروشوں کی طرح
داغِ سودا بیچتے ہیں لالہ رُو بازار میں

کیا لطافت ہے کہ مُنہ میں پان جب اُس نے لیا
سبزۂ خط سا نظر آنے لگا رُخسار میں

موسمِ گل کر گیا پرواز باغِ دہر سے
یاں ابھی تنکے ہیں بہرِ آشیاں منقار میں

ہم زبانِ شمع سے سنتے ہیں ہجرِ یار میں
چاہیے گھُل گھُل کے مرنا عشق کے آزار میں

ہے اثر کس کی نگاہِ تفرقہ انداز کا
بُلبُلیں ہیں دام میں، آوارہ گُل بازار میں

گرمیِ بازارِ یوسف آ گئے اُس کے کیا
مُنہ دکھاتے ہی لگا دے آگ جو بازار میں

آفتابِ حشر بھی مجھ کو بچا کر جائے گا
سونے والا ہوں کسی کے سایۂ دیوار میں

دشتِ وحشت میں مجھے فکرِ تنِ عریاں نہیں
خار ہوں، لیکن خیالِ گوشۂ داماں نہیں

خار اور خوں خوار ہیں باغِ جہاں میں ہم نصیب
موسمِ گل میں شگفتہ غنچۂ پیکاں نہیں

لاغری سے یاں نہیں ہے جسم، لیکن جان ہے
جس طرح سے جسم تصویروں کا ہے، اور جاں نہیں

گو نظر آتا نہیں، لیکن دہانِ یار ہے
کون کہتا ہے جہاں میں چشمۂ حیواں نہیں

نامۂ اعمالِ ناسخ ہے تری زلفِ سیاہ
آفتابِ حشر ہے، یہ عارضِ تاباں نہیں

کل تلک آراستہ دیکھی ہے جس جا بزمِ رقص
آج واں کوئی بگولوں کے سوا رقصاں نہیں

سبزۂ خط ہے، دہانِ یار نظروں سے نہاں
خضر ہے لیکن نشانِ چشمۂ حیواں نہیں

بُت پرستی کیا بُری ہے، گر خدا ملتا نہیں
کفر میں کامل ہو ناسخ، گر تجھے ایماں نہیں

طولِ شبِ فراق کے شکوے سے فائدہ
حاصل نہیں ہے دستِ تمنا کو غیرِ یاس
ظالم سے اہلِ فیض کو ہوتا نہیں گزند

میں جاں بہ لب ہوں مجھ کو امیدِ سحر کہاں
اِس باغ میں چنار نے پایا ثمر کہاں
ہے نخلِ میوہ دار کو رنجِ تبر کہاں

عاشق ہے، پر ابھی نہیں فرقت ہوئی نصیب ‏ ‏ ہے اضطراب کی تجھے ناسخ خبر کہاں

دل ہی اُس کا جانتا ہے جس پہ گزرا ہے یہ حال
عشق کا صدمہ زبانوں سے بیاں ہوتا نہیں
کر دیا ہے غیب بیں چشمِ تصور نے مجھے
حُسن تیرا لاکھ پردوں میں نہاں ہوتا نہیں
خاکساروں سے ہے ہر جا سرکشوں کی سرکشی
وہ زمیں ہے کون جس پر آسماں ہوتا نہیں
جو سعادت مند ہیں، رہتے ہیں وہ بے خانماں
دہر میں پیدا ہُما کا آشیاں ہوتا نہیں
جتنے ہیں صاحب سخن، اُن کی طبیعت نرم ہے
ہے دلیل اس پر، زباں میں استخواں ہوتا نہیں
دم ہے جب تک جسمِ عاشق میں ہے خامی کی دلیل
خوب جل جاتی ہے جو شے، پھر دھواں ہوتا نہیں

ہو جو تیرا روے رنگیں پرتو افگن آب میں
جاے ماہی، بُلبلوں کا ہو نشیمن آب میں
کھول دے زلفیں لبِ دریا کہ لہریں شرم سے
ڈوب جائیں صورتِ زنجیرِ آہن آب میں
تو لبِ دریا اگر جائے اندھیری رات کو
قمقمے سارے حبابوں کے ہوں روشن آب میں

ہے جو اُفتادہ، اُسے کیا ضربِ دشمن سے گزند
تیر لگتے اسے نہیں، پڑتا ہے روزن آب میں

لعلِ خنداں کا تصور دیدۂ گریاں میں ہے
دیکھنا، لعلِ بدخشاں کا ہے معدن آب میں

جمع ہوتے ہیں نہانے کو ہزاروں گُل بدن
روز آتے ہیں نظر پھولوں کے خرمن آب میں

پاک ہیں آلودگی سے، جو ہیں وارستہ مزاج
تر نہیں ہوتا کبھی صرصر کا دامن آب میں

دیتی ہے اکثر زبانِ چرب آفت سے نجات
جس طرح ہوتا نہیں ہے غرق روغن آب میں

جو کوئی نکلا وطن سے، خوں ہوا اس کا جگر
سبز ہے، جب تک کہ ہے مرجان کا مسکن آب میں

ہوں جہاں میں، پر ہے رزقِ عالمِ بالا پہ دھیان
ہے صدف محتاجِ نیساں، اور مسکن آب میں

گریہ ہے ترسا بچوں کے غم میں ناسخ جوشِ اشک
کیا تعجب غرق ہو جائے جو لندن آب میں

میں گو کہ حُسن سے ظاہر میں مثلِ ماہ نہیں
ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں

ہمیشہ کام میں غیروں کے ہیں سعادت مند
ہما کو اپنے لیے فکرِ عزّ و جاہ نہیں

عبث ہے یار کو مجھ دل جلے کے قتل میں سوچ
چراغِ کشتہ کا کوئی کبھی دادخواہ نہیں

مردِ وارستہ کہیں قیدِ مکاں کرتا نہیں
طائرِ نکہت خیالِ آشیاں کرتا نہیں

روز اک شام و سحر کرتا ہے پیدا بہرِ خلق
صبح میری شامِ غم کو آسماں کرتا نہیں

ہے ہر اک آفت سے ایمن مسکنِ اہلِ فنا
باغِ جنت کو خدا ہرگز خزاں کرتا نہیں

جامِ مے میں دیکھتا ہوں میں جہاں کو مثلِ جم
گو سکندر کی طرح سیرِ جہاں کرتا نہیں

سر پہ کف پھرتا ہوں میں، لیکن کوئی قاتل نہیں
گردنِ خم گشتہ شاید تیغ کے قابل نہیں

زندگانی خلق کی ہے دستِ قاتل سے محال
کشتۂ حسرت ہے، جو تلوار سے بسمل نہیں

سمجھے گھر غفلت میں گو ہم خانۂ زیں کو، ولے
توسنِ عمرِ رواں رفتار سے غافل نہیں

کیا ہے نسبت ماہِ نو کو ابروئے خم دار سے
تیغ کی صورت ہے، پر اُس کا کوئی گھائل نہیں

کیا بحرِ حُسن کی ہے کمر پیچ و تاب میں
یہ پیچ و تاب کب ہیں بھلا موجِ آب میں

ہم مست بھی ہیں تارکِ لذات زاہدا
اک دن تو دیکھ، کیسی ہے تلخی شراب میں

صبحِ شبِ وصال کے ہوتے ہی ہم کہاں
ہے زہر ساقیا قدحِ آفتاب میں

کیا پڑ گیا ہے عکس تری چشمِ مست کا
نرگس کی شاخ بن گئی ہر موجِ آب میں

بحرِ فنا میں ضد ہے تعین سے یک دگر
پانی جو موج میں ہے، وہی ہے حباب میں

مستوں کا عیش تلخ ہے دیرِ خراب میں
یہ رمز ہے، جو ہوتی ہے تلخی شراب میں

آئی قیامت، اُس نے لگایا ہے مُنہ سے جام
ہے اتصال ماہ میں اور آفتاب میں

غفلت سے، اپنا طالبِ دیدار آپ ہوں
میرا ہی چہرہ ہے جو نہاں ہے نقاب میں

ساغر میں عکسِ رُخ، رُخِ گلگوں پہ ہے عرق
موتی جو آگ میں ہے، تو شعلہ ہے آب میں

بیدار دل جو ہیں، انھیں سونے سے کیا ضرر
یوسف ہوا ستاروں کا مسجود خواب میں

عبرت کے واسطے، یدِ قدرت نے غافلو!
کھینچی شبیہ افسرِ شاہی حباب میں

اُس گل کی شکل پھرتی ہے چشمِ پُر آب میں
اشکوں میں لختِ دل نہیں، گل ہیں گلاب میں

کرتا ہے اک جہان بسر شب کو خواب میں
ہوں کیوں نہ مستِ بادۂ غفلت شباب میں

ہے رات چودھویں، مجھے ساقی پلا شراب
روشن ہو آفتاب، شبِ ماہ تاب میں

مر گیا میں بے قراری سے اُسے کچھ غم نہیں
کشتۂ سیماب ہوں، جو لائقِ ماتم نہیں

اس قدر مجھ کو بخیلوں سے پڑا دنیا میں کام
اتنی شہرت پر یقینِ ہمتِ حاتم نہیں

ہوتی ہے سامانِ غفلت سے بھی اک عبرت مجھے
جامِ مے دیکھا، تو دھیان آیا جہاں میں جم نہیں

اپنی استغنا سے ہے باغِ جہاں ایسا خجل
کون شاخِ پُر ثمر ہے، جس کی گردن خم نہیں

باعثِ رنج اہلِ دنیا سے ہے، ناسخ گفتگو
غیرِ خاموشی، پئے زخمِ دہاں مرہم نہیں

نکہتِ گل کہتی جاتی ہے زبانِ موج سے
قابلِ نظّارہ رنگِ گلشنِ عالم نہیں

شکل اِن کی دیکھ کر ہوتی ہے استغنا مجھے
یہ بخیل اِس عہد کے، ناسخ، کم از حاتم نہیں

دوست دنیا میں نہیں کوئی کسی کا بے غرض
ہو گئی جب صبح، شمعِ مُردہ کا پھر غم نہیں

آنکھ نرگس کی نہیں ہرگز جھپکتی اس لیے
ایک لمحے میں بہارِ گلشنِ عالم نہیں

ہیں شرر پتھر میں پنہاں، پر جہاں آگاہ ہے
کون ہے جو میرے سوزِ عشق سے محرم نہیں

یار کو ناسخ یہ لکھ مصراعِ استادِ قدیم   "دیر کی تم نے ذرا آنے میں تو پھر ہم نہیں"

بُلبُلیں کیا، تو وہ ہے صیاد اے رشکِ چمن
طائرِ بوئے چمن کے تیرے آگے پر نہیں

مفلسوں کے مُنہ سے ہوتی ہے بہت شرمندگی   زر دیا اے منعمو بے وجہ روئے زر نہیں
اے تصور، کیوں بُتوں کو جمع کرتا ہے یہاں   دل مرا کعبہ ہے، کچھ بُت خانۂ آزر نہیں
طفل چلتے ہیں جب اپنے پانو، کہتی ہے قضا   غیرِ آغوشِ لحد، اب دامنِ مادر نہیں
ہے خراباتِ جہاں میں بھی وہ ساقی سے نفور   جو کہ اے ناسخ، غلامِ ساقیِ کوثر نہیں

بُتوں کے پردے میں ہم دیکھتے ہیں نورِ خدا   کہ صاف دیکھنے کی اے کلیم، تاب نہیں

خندۂ صبحِ شبِ عشرت سے یہ مفہوم ہے   موت کا پیغام بھی تھا، وصل کے پیغام میں
علتِ کعبہ میں بھی مے خانہ گریباں گیر ہے   داغِ مے ناسخ ہیں اپنے جامۂ احرام میں

دمِ خرام، چمن نقشِ پا سے بھولتے ہیں   بجا ہے گر وہ کہے، موسمِ بہار ہوں میں

جہاں کے عشق بازوں کا ہے مجمع کوئے جاناں میں
نہ پروانہ ہے محفل میں، نہ بُلبُل ہے گلستاں میں
بھلا دیکھیں تو کیوں کر روکتا ہے باغباں ہم کو
خزاں کے ساتھ ہم آئیں گے اب کے اس گلستاں میں

عبث ہے اے دلِ پُر داغ، ارادہ کوے جاناں کا
گزر طاؤس کا ممکن نہیں ہے باغِ رضواں میں

ہوا راہِ طلب میں سست، زہدِ خشک سے زاہد
روانی کب ہے دریا کی طرح ریگِ بیاباں میں

نہیں ممکن کہ ہو اصلاح ظالم کی طبیعت کو
رہے خوں ریز خنجر، گر بجھائیں آبِ حیواں میں

احتیاط اس قدر اس کی تو عبث کرتا ہے — جسم آخر ہے ترا خاک، کچھ اکسیر نہیں
ہوئی اِس بزم میں بے طور زباں جس کی دراز — شمع کی طرح سے سر کٹنے میں تاخیر نہیں
کیوں مرقع نہ کہیں دفترِ کونین کو ہم — فرد وہ کون ہے جس میں تری تصویر نہیں
لال مُنہ خشم سے اُس کا ہو، تو ڈریو نہ دلا — آتشِ گل میں جلا دینے کی تاثیر نہیں
تنگ ہوں زیست سے، ہو جاؤں کسی پر عاشق — کوئی اور اس کے سوا مرنے کی تدبیر نہیں
قاصدا، حالِ سراپا ہے، سراپا مرقوم — اپنا مکتوب، کم از کاغذِ تصویر نہیں
اِس زمیں میں یوں ہی اشعار پڑھے جا ناسخ — دل کے بہلانے کی اور اب کوئی تدبیر نہیں

مٹ گئے نقشِ حیات اور اُسے تاثیر نہیں — اے پری خواں، یہ پری زادوں کی تسخیر نہیں
کارِ حیرت زدگاں میں ہے کہاں غیر کو دخل — شمعِ تصویر کو کچھ حاجتِ گل گیر نہیں
کوئی غفلت بھی حقیقت سے نہیں ہے خالی — کون سا خواب ہے جس کے لیے تعبیر نہیں
بس دلا، صورتِ ہستی کو کوئی دم ہے ثبات — یہ جہاں آئنہ ہے، کاغذِ تصویر نہیں
گل رخوں کا جو تصور ہے سخن سنجی میں — گل فشانی ہے یہ ناسخ، تری تقریر نہیں

قابلِ روحِ سبک رو، بدنِ پیر نہیں
ایک دم ساکنِ آغوشِ کماں، تیر نہیں

خط نمایاں نہ ہو یا رب رخِ جاناں پہ کبھی
یہ وہ مصحف ہے جسے حاجتِ تفسیر نہیں

ایک کو عالمِ حیرت میں نہیں ایک سے کام
شمع تصویر سے روشن شبِ تصویر نہیں

سر و ساماں ہو بہم زیرِ فلک، مشکل ہے
سر مرا ہے، تو کفِ یار میں شمشیر نہیں

بے دہن بات مسیحا سے بھی ہوتی نہ کبھی
قدرتِ حق ہے یہ اے بت تری تقریر نہیں

ہے صنم، رشکِ طلا رنگ سنہرا تیرا
خاک کے سامنے کچھ رتبۂ اکسیر نہیں

شبہہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میر نہیں

جب سے کہ بتوں سے آشنا ہوں
بے گانہ خدائی سے ہوا ہوں

کیوں کر کہوں، عارفِ خدا ہوں
آگاہ نہیں کہ آپ کیا ہوں

جب ہجر میں باغ کو گیا ہوں
میں آتشِ گل میں جل بجھا ہوں

فرقت میں جو سر پٹک رہا ہوں
مشغولِ نمازِ بے ریا ہوں

بے گانہ ہوں کیوں کر آشنا سے
بے گانوں سے بھی میں آشنا ہوں

منہ اُن کا نہیں ہے شکر، ورنہ
ہر بت کہتا کہ میں خدا ہوں

امیدِ وصال اب کہاں ہے
اس گل سے بہ رنگِ بو جدا ہوں

خلقت خوش ہو، جو میں ہوں پامال
گلزارِ جہاں میں کیا حنا ہوں

ہنس دوں گا دم میں مثلِ گل آپ
غنچے کی طرح سے گو خفا ہوں

کرتے ہیں گریز مجھ سے منحوس
بے شبہہ میں سایۂ ہما ہوں

ناسخ کی یہ التجا ہے یا رب!
مرجاؤں تو خاکِ کربلا ہوں

اس ابر میں، یار سے جدا ہوں — بجلی کی طرح تڑپ رہا ہوں
گو بیٹھ رہا ہوں ایک جا، لیک — پامال بسانِ نقشِ پا ہوں
افتادۂ خاک ہوں و لیکن — میں سایۂ شہپرِ ہما ہوں
تو رنگِ چمن، میں ہوشِ بلبل — تو نکہتِ گل، تو میں صبا ہوں
سر رکھ کے کبھی وہ سو گیا تھا — اب تک زانو کو سونگھتا ہوں
آئینۂ دل میں ہے ترا عکس — دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

آ گیا تھا رات کیا وہ ماہِ کامل خواب میں
چاندنی کا ہے اثر زخمِ دلِ بے تاب میں

شاخِ مرجاں موجیں، عکسِ دستِ رنگیں سے بنیں
پرتوِ رخ سے، ہوئے روشن کنول تالاب میں

بزمِ مے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا کوہِ غم
بارِ سنگیں جیسے ہو جاتا ہے ہلکا آب میں

گوہرِ مضموں لیے پھرتے ہیں دیواں شہر شہر
ہے رواں میرا سفینہ موتیوں کے آب میں

طالبِ حق ہے اگر، مت سالکوں کا ساتھ چھوڑ
مل گیا دریا میں، جو کچھ مل گیا سیلاب میں

کس نے چہرے سے اٹھائی ہے لبِ دریا نقاب — کوندتی ہیں بجلیاں، لہروں کے بدلے آب میں
جلوہ بینی ہے یوں محرابِ ابرو کے تلے — شمعِ روشن جس طرح رکھ دے کوئی محراب میں
دانے ہیں انگیا کی چڑیا کو، بنت کی چنیاں — پلتی ہے بالے کی مچھلی، موتیوں کے آب میں

ہوگئے ہیں کور اگر اعدا عداوت سے تو کیا　　نور ہیں اشعارِ ناسخ دیدۂ احباب میں

کون صیاد آج آتا ہے چمن میں بلبلو　　رنگ گل کہتا ہے، اُڑ جانے کو میں آمادہ ہوں
رہ نمائی میری، کرتی ہے مجھے پامالِ خلق　　خضرِ راہِ منزلِ مقصود مثلِ جادہ ہوں

صنم، کوچہ ترا ہے اور میں ہوں　　یہ زندانِ وفا ہے اور میں ہوں
یہی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا　　کہ اک ذاتِ خدا ہے اور میں ہوں
نہ ہو کچھ آرزو مجھ کو خدایا　　یہی ہر دم دعا ہے اور میں ہوں
گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھ کو　　اب اُس کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں
سرکشی شمع کی لگتی نہیں گر اُن کو بُری
لوگ کیوں بزم میں گُل گیر لیے پھرتے ہیں
تا گنہ گاری میں ہم کو کوئی مطعون نہ کرے
ہاتھ میں نامۂ تقدیر لیے پھرتے ہیں

دل اُس کو دیا میں نے، تقصیر اسے کہتے ہیں
مارا غمِ فرقت نے، تعزیر اسے کہتے ہیں
پی جب کہ شراب اس نے، کندن سا بدن دمکا
سونا اسے کہتے ہیں، اکسیر اسے کہتے ہیں

شکل اس کی تصور نے کھینچی ورقِ دل پہ
نقاش اسے کہتے ہیں، تصویر اسے کہتے ہیں

انجام کو کچھ سوچو، کیا قصر بناتے ہو
آباد کرو دل کو، تعمیر اسے کہتے ہیں

دل میں پوشیدہ تپِ عشقِ بتاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کے مانند نہاں رکھتے ہیں

بزمِ جاناں میں کبھی بات نہ نکلی منہ سے
کہنے کو شمع کے مانند زباں رکھتے ہیں

مثلِ پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تجھ پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

ہو گیا زرد، پڑی جب کہ حسینوں پہ نظر
یہ عجب گل ہیں کہ تاثیرِ خزاں رکھتے ہیں

تازگی ہے سخنِ کہنہ میں یہ بعدِ وفات
لوگ اکثر مرے جینے کا گماں رکھتے ہیں

بھا گئی کون سی وہ بات بتوں کی ورنہ
نہ کمر رکھتے ہیں کافر، نہ دہاں رکھتے ہیں

عوضِ ملکِ جہاں، ملکِ سخن ہے ناسخ
گو نہیں حکمِ رواں، طبعِ رواں رکھتے ہیں

طمعِ خام سے پھیلے جو کسی کے آگے یارب، ایسا تو مجھے ہو نہ میسر دامن

آستیں زن ہے یہاں کوئی چراغِ جاں پر
کھا گیا واں روشِ ناز سے ٹھوکر دامن

یہی کہتی ہوئی جاتی ہے چلی عمرِ رواں
میرے دامن سے نہ باندھے کبھی صرصر دامن

ہے دلا، کس کو دوام اس گردشِ افلاک میں
خاک کے پتلے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں

فاقہ مستی میں قناعت ہو جو تم کو مے کشو!
ہے لبالب بادۂ عشرت خُمِ افلاک میں

شش جہت میں موج زن ہے تو ہی اے دریائے حسن
فرق کیا ہے ڈوبنے والے میں اور تیراک میں

مقبرے کو جائے شادی سمجھے، سو دیوانہ ہے
دفن لاکھوں ہو گئے اس گنبدِ افلاک میں

خوش قدوں کی خاک یہ اُٹھتی ہے ہر دم سرو قد
گردباد، اے اہلِ غفلت، اس بیاباں میں نہیں

دیکھنا، کل آپ سے کوئی نہ رکھے گا قدم
آج جانے کی اجازت جس گلستاں میں نہیں

ہے جو یوں مکروہ طبعِ پاک کو مضمونِ غیر
وصل کا مضمون شایاں اپنے دیواں میں نہیں

نامِ خاتم رہ گیا ہے، ہو گیا برباد تخت
آدمی کیا، دیو بھی مُلکِ سلیماں میں نہیں

کیا ہوا اگر شعر ناسخ ہیں عقیدے کے خلاف
آیۂ منسوخ کیا موجود قرآں میں نہیں

باغباں! ممنوں ترے ہم اِس گلستاں میں نہیں
جُز دلِ صد چاک، گُل اپنے گریباں میں نہیں

ذکر کیا شاہ و گدا کا، اصل میں دونوں ہیں ایک
فرق مر جانے کے بعد انسان و حیواں میں نہیں

رحمتِ حق جوش پر ہے، کیوں نہ عصیاں کیجیے
شغل بہتر مے کشی سے ابر و باراں میں نہیں

اسفل و اعلا مشابہ ہیں بہم، لیکن ہے فرق
اوجِ انجم، دیدۂ غولِ بیاباں میں نہیں

کس قدر گھونگھٹ میں تاباں ہے وہ روئے آتشیں
روشنی ایسی چراغِ زیرِ داماں میں نہیں

کیا تری جالی کی کُرتی میں چمکتا ہے بدن
یہ فروغ اے سرو قد سروِ چراغاں میں نہیں

ہے نہاں صبحِ شبِ غم، کیا ہوئی تاثیر ختم
سورۂ والشمس، شاید اپنے قرآں میں نہیں

بے وطن ہو کر، زمانے میں ہوئے نالاں بشر
آشنا نالوں سے نَے، ہرگز نیستاں میں نہیں

مثلِ مجنوں کس لیے صحرا بہ صحرا ہے خراب
کیا رسائی تجھ کو ناسخؔ، کوئے جاناں میں نہیں

گدائے مے کدہ کس چین سے ہے خاک نشیں
یہ عیش تخت پہ کب بادشاہ کرتے ہیں

خبر نہیں جنھیں کچھ انقلابِ گردوں کی
غرورِ نیّرِ اقبال و جاہ کرتے ہیں

جو نا اُمید ہیں، اہلِ وَرَع ہیں اے ناسخؔ
اُمید دارِ شفاعت، گُناہ کرتے ہیں

چاک کرنے کے لیے اے ناصح
ہم گریبان سیا کرتے ہیں

زندگی، زندہ دلی کا ہے نام
مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

سنگِ اسود بھی ہے بھاری پتّھر
لوگ جو چُوم لیا کرتے ہیں

شاد ہیں باغِ فنا میں کب گُل
اپنی ہستی پہ ہنسا کرتے ہیں

دفن محبوب جہاں ہیں ناسخؔ
قبریں ہم چُوم لیا کرتے ہیں

ہو گئے کیا ترے تلوے گُل گوں
سنگِ پا، کارِ حنا کرتے ہیں

موسمِ گُل میں بشر ہیں معذور
گُل تلک چاک قبا کرتے ہیں

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں، وہاں آسماں نہیں

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب
یاں اعتمادِ دوستیِ جسم و جاں نہیں

آنکھوں سے فائدہ، جو نہیں تیری گردِ راہ
حاصل جبیں سے کیا، جو ترا آستاں نہیں

منعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی
تنہا برائے لذّتِ دُنیا زباں نہیں

پژمُردہ ایک ہے، تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

موتیوں کا نہیں گُچھا یہ ترے بالے میں
آیا ہالے میں نظر عقدِ ثُریا مجھ کو

زاہدا، کعبے کو تِرے خانے سے جانا ہے محال
ہے ہر اک شیشۂ مے، آبلۂ پا مجھ کو

طفل سمجھا ہے مگر پیرِ فلک، جو شب و روز
شیشہ بازی کا دکھاتا ہے تماشا مجھ کو

سیر کر کر کے چلا جاؤں گا مانندِ نسیم
چمنِ دہر میں درکار نہیں جا مجھ کو

کون ہیں جو بہرِ زر انسان کو کرتے ہیں قتل
ہم نہ بہرِ کیمیا کُشتہ کریں سیماب کو

اس قدر ہے اہلِ دنیا میں دنائت کا رواج
بس ہو تو مثلِ صدف باندھیں گرہ میں آب کو

ہیں جو صاحب درد، اُن کو زہر ہے سامانِ عیش
موت کا سامان، زخمی گنتے ہیں مہتاب کو

قدر جیتے جی نہیں ہے کچھ بھی اے ناسخ مجھے
یاد مدفن میں کروں گا صحبتِ احباب کو

کب سبک دوش رہے قیدیِ زندانِ وطن
بوئے گُل پھاندتی ہے باغ کی دیواروں کو

کافرِ عشق ہوں، حاجت نہیں زنّار کی بھی
بارِ تسبیح مبارک رہے دیں داروں کو

دھیان آیا جو مجھے زمزمہ پردازی کا
رہ گئے مُرغِ چمن کھول کے منقاروں کو

ہاتھ پر رکھ کے دیا جامِ شرابِ پُرنور
آج ساقی نے دکھایا یدِ بیضا مجھ کو

گل سے چھپتی نہیں بو، راز چھپے گا کیوں کر
کر نہ دے چاکِ گریباں کہیں رسوا مجھ کو

وہ تو غفلت سے یہ کہتا ہے کہ کل آؤں گا
اور اک دم نہیں جینے کا بھروسا مجھ کو

وہ خریدار رہوں بازارِ جہاں میں ناسخؔ
غیرِ سودا نہیں ملتا کوئی سودا مجھ کو

کان دیتا گُل کو بھی، بُلبُل کو گر نالہ دیا
تھا یہ لازم نخل بندِ گلشنِ ایجاد کو

فصلِ گُل آئی ہے پھر اپنے جنوں کا جوش ہے
بلبلیں آتی ہیں گلشن سے مبارک باد کو

شادی و غم کو نہیں ہے اپنے ویرانے میں بار
یہ تلوّن ہو مبارک خانۂ آباد کو

وصل کی شب جب رکھا اُس نے مرے گھر میں قدم
صبحِ خنداں رُو ہوئی حاضر مبارک باد کو

مشقِ تصویر اُس کو ہے، مشقِ تصوّر ہے مجھے
اپنی صنعت میں دکھا سکتا نہیں بہزاد کو

بہ رنگِ حُسنِ بُتاں ہے دلِ شگفتہ مرا
جو اِس چمن کو خزاں ہو تو پھر بہار نہ ہو

گئی ہے کیسی زمانے سے رسمِ سرگرمی
عجب نہیں ہے جو پتھر میں بھی شرار نہ ہو

دمِ اخیر تو کر لوں نظارہ جی بھر کر
الٰہی، خنجرِ سفاک آب دار نہ ہو

ہوس عروج کی لے جائیں گر نہ دُنیا سے
کبھی بلند ہوا سے کوئی غبار نہ ہو

ناتواں ہو کے جہاں میں رہوں ایسا ناسخؔ
کہ مرے پانو سے چیونٹی کو بھی آزار نہ ہو

گبر نفرت کرے، آگاہ اگر حال سے ہو
شرم آتی ہے جو کہتے ہیں مسلماں مجھ کو

اُس کا دیدار جو ہوگا تو قیامت ہوگی
کر دیا یار کی تصویر نے حیراں مجھ کو

رنگ اِسے کہتے ہیں، آویزہ کیا یاقوت کا
عکسِ روئے یار نے، آویزۂ بلّور کو

دیتی ہیں زلفیں تری، رُخ سے زیادہ مجھ کو رنج
دن سے افزوں رات بھاری ہوتی ہے رنجور کو

قصر اے منعم بناتا ہے تو اوروں کے لیے
جانتے ہیں ہم برابر تجھ کو اور مزدور کو

زاہدا، ہے کس قدر مشکل حسینوں کا وصال
جیتے جی پاتے ہیں حق کو، بعدِ مُردن حور کو

کاسۂ چینی پہ اے منعم نہ کر اتنا غرور
ہم نے دیکھا ٹھوکریں کھاتے سرِ فغفور کو

بُت پرستی میں ہے ناسخ، حق پرستی کا خیال
دیکھتے ہیں ہر صنم میں ہم خدا کے نُور کو

خرابی ایک کی، تو دوسرے کی یاں ہے آبادی
بناتا ہے فلک تُربت، گرا کر خانۂ تن کو
وطن مجھ بے قرارِ عشق سے چھوٹا تو بس چھوٹا
نکل کر جا نہیں سکتا ہے پھر سیماب، معدن کو

حسینوں کو تلاشِ رزق کب ہوتی ہے غربت میں
لیے پھرتے ہیں مثلِ ماہ گویا ساتھ خرمن کو
لٹک آئی جو بازو پر کوئی لٹ زلفِ پیچاں کی
کیا سونا سگندا اُس نے ترے سونے کے جوشن کو

مصائب نظم کرتا ہوں شبِ تاریکِ ہجراں کے
بنایا شمعِ بزمِ فکر میں نے طبعِ روشن کو
گریبانِ سحر میں جیسے ہے رنگِ شفق لازم
نہ چھوڑے گا لہو میرا کبھی قاتل کے دامن کو

رسائی ہے متاعِ حُسن تک کب دستِ دشمن کو
نہیں ہوتی کبھی بجلی کی دہشت مہ کے خرمن کو
اگر طولِ امل ہو قطع، ہے ترکِ لباس آساں
کہ رشتے کی بدولت ربط ہے کپڑوں سے سوزن کو
کرے تیرے مسی آلودہ ہونٹھوں کی ثنا خوانی
خدا نے اس لیے اتنی زبانیں دی ہیں سوسن کو
بھلا غیر از غزل خوانی ہو مجھ سے کام کیا ناسخ
بہ جُز نالہ نہیں آتا ہے کچھ مُرغِ نوازن کو

بے ثباتی ہے نہایت حُسنِ بے ناموس کو
پایداری ہوتی ہے کم شمعِ بے فانوس کو
ہے گریز اُس زلف کو میرے دلِ پُر داغ سے
بھاگتے ہیں سانپ جیسے دیکھ کر طاؤس کو
اِس لیے جھوٹا بھی وعدہ وصل کا کرتا نہیں
تا نہ تسکیں ہو کبھی میرے دلِ مایوس کو
دل اگر فارغ نہیں، ناساز ہے سازِ نشاط
عید کے دن رنج ہوتا ہے فزوں محبوس کو

کہاں تھا اے بتو، ہم کو دماغِ ناز برداری
خدا کرتا ہے شرمندہ ہماری بے نیازی کو
ثمر پختہ جو ہے اے خام طبعو، باغِ عالم میں
نہ کیوں کر خاک ساری سے وہ بدلے سرفرازی کو

مرہمِ زنگار رکھ میرے دلِ پُر داغ پر
ہے طلسمِ تازہ گر سروِ چراغاں سبز ہو
فیضِ ظالم سے نہیں پایا کسی نے غیرِ ظلم
آبِ خنجر سے بھلا کیا کشتِ دہقاں سبز ہو

تیز ہردم کرتی ہے تیغِ نگاہِ یار کو
چشم کی گردش ہوئی ہے سان، اس تلوار کو
یوں نزاکت سے گراں ہے سُرمہ چشمِ یار کو
جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار کو
خاک سارانِ جہاں کا ہے ادب ایسا مجھے
پانو رکھتا ہوں بچاکر سایۂ دیوار کو
دل میں ایمن ہو نہ خوں خوارو، جو دشمن ہے ضعیف
مورچہ دیکھو تو کھا جاتا ہے کیا تلوار کو
رُتبۂ اعلا میں ظالم ترک کر دیتے ہیں ظلم
پانو سے کاہش نہیں خارِ سرِ دیوار کو
جب کہ بیت اللہ میں ناسخ بتوں کا ہو مقام
بار کیوں کر ہو نہ بزمِ یار میں اغیار کو

دی ہے خالق نے ازل سے آبرو تلوار کو
کیوں نہ آنکھوں پر جگہ ہو ابروِ خم دار کو
کون ہے گلگشت کا عازم، کہ استقبال کو
گُل پیادہ ہو کے گلشن سے چلے بازار کو
کیا دلا، شکوہ بتوں کا، قصۂ موسیٰ ہے یاد
رنج دیتا ہے خدا بھی طالبِ دیدار کو
سامنے خالق کے اے ناسخ، کراماً کاتبین
روز لے جاتے ہیں لکھ لکھ کر مرے اشعار کو

ہے بُروں کو عیش اور اچھوں کو ہے دنیا میں رنج
توڑتا ہے گل کو گل چیں، چھوڑتا ہے خار کو

قتلِ دشمن کے لیے بھی چاہیے نرمی ضرور
ٹوٹ جاتے بیشتر دیکھا کڑی تلوار کو

خود بہ خود اُفتادگانِ خاک کا ہوتا ہے اوج
نردباں درکار ہے کیا سایۂ دیوار کو

دل شکستہ گلشنِ عالم میں ہوں اے رشکِ گُل
صورتِ شاخِ شکستہ کیوں نہ پیکر خشک ہو

جو کہ ظالم ہیں، وہ ہرگز تر زباں ہوتے نہیں
کیوں نہ خوں ریزی سے، آبِ تیغ و خنجر خشک ہو

چشمِ تر کو گرمیِ داغِ جنوں سے کیا ضرر
تابشِ خورشید سے گرداب کیوں کر خشک ہو

نہ لائے عالمِ بالا سے کیوں طوبا کے مضموں کو
خیالِ قامتِ موزوں ہے میری طبعِ موزوں کو

رہائی کی نہیں تدبیر کوئی زلفِ جاناں سے
یہ وہ مارِ سیہ ہے جو بھلا دیتا ہے افسوں کو

جو شب بیدار ہیں، وہ غافلوں پر رہتے ہیں غالب
بہت سی فوج پڑ جاتی ہے تھوڑی فوج شب خوں کو

غضب ہے سرو باندھا اُس پری کے قدِ گُل گوں کو
یہ کس شاعر نے ناموزوں کیا مصراعِ موزوں کو

نہ کوئی مالِ دُنیا کا اُٹھا لے جائے گا سر پر
زمانے میں نصیب ایسے ملے بس ایک قاروں کو

کسی کے گوشۂ دل پر تصرّف سخت مُشکل ہے
یہ ممکن ہے، مُسخّر کوئی کر لے رُبعِ مسکوں کو

مسخر کر لیا لاکھوں پری زادانِ مضموں کو
غضب افسوں گری آتی ہے میری طبعِ موزوں کو

ہے اُس میں چہرۂ روشن، تو ہے نورِ آفتاب اِس میں
مرے روزِ سیہ سے کیا ہے نسبت زلفِ شب گوں کو

خراباتِ جہاں میں ترکِ عشرت کرتے ہیں دانا
پسند آیا اسی خاطر خُمِ خالی فلاطوں کو

اگر ایسی ہے اِن اہلِ دَوَل کی پستیِ ہمت
یقیں ہے، رفتہ رفتہ لیں گے سر پر گنجِ قاروں کو

جو دَنی ہیں، وہ بھی کرتے ہیں حسینوں سے سلوک
اِس دنائت پر، فلک دیتا ہے خرمن ماہ کو

کیا حسد سے چاک ہوتے ہیں جگر مانندِ صبح
دیکھ کرتا باں کسی کے آفتابِ جاہ کو

پستیِ ہمت سے بچتا ہے کوئی مالِ بخیل
زور سے اہلِ جہاں لیتے ہیں آبِ چاہ کو

ہے خراباتِ جہاں میں عام فیضِ مَے فروش
مستیِ مَے ہوتی ہے یک ساں گدا و شاہ کو

گر غرض ناچیز سے نکلے، اُسے رکھیے عزیز
پیار سے آغوش میں لیتا ہے شعلہ، کاہ کو

عشق جب وارد ہوا، کی عقل نے دل سے گریز
ایک جا دیکھا ہے کس نے شیر اور روباہ کو

ہر صاحبِ خزانہ کو ہے اوج ہی زوال
پٹکے نہ کیوں اُچھال کے فوارہ، آب کو

جُز داغِ عشق، چارۂ تر دامنی نہیں
کرتی ہے خشک گرمیِ خورشید آب کو

ہم صورتوں سے عیب ہے کرنا سوال کا
زلفوں سے مانگتی ہے کمر پیچ و تاب کو

اُس شعلہ رو کو ربط ہو مجھ ناتواں سے کیا
پروا نہیں کمان کی تیرِ شہاب کو

ساقی! جہانِ دل کی اسی سے ہے روشنی
کیوں کر نہ آفتاب کہیں ہم شراب کو

نکلیں گے طفلِ اشک نہ باہر، کہ ضبط نے
گرداب کر دیا مری چشمِ پُر آب کو

صدمے اُٹھانے والے ہیں روزِ فراق کے
کیا لائیں ہم شمار میں روزِ حساب کو

دی آگ اُس نے پرتوِ رُخ سے شراب کو
شرمندہ جام نے سے کیا آفتاب کو

بھولوں وصالِ یار میں کیا اضطراب کو
دریا میں ہے قرار کہاں موجِ آب کو

اِس دل کے ہاتھوں چین سے گزرا نہ ایک دن
پیری میں یاد کیا کروں عہدِ شباب کو

مٹتا ہے دم میں صفحۂ عالم سے نام بھی
کھد وا رہے ہو مُہر میں تم کیا خطاب کو

آئی شبِ وصال، ہوئی صُبح شام سے
قسمت نے آفتاب کیا ماہ تاب کو

امتیازِ حق و باطل خود ستاؤں کو کہاں
کیوں نہ فرعون، ایک سمجھے سحر اور اعجاز کو

بلبلیں کیا ہیں، جو وہ صیاد آئے باغ میں
بھول جائیں طائرِ رنگِ چمن پرواز کو

ہو گیا ہے اس قدر بے قدر عالم میں ہُنر
کیا عجب، گر عیب سمجھیں جوہرِ شمشیر کو

کچھ نظر آیا نہ اِس غفلت کدے میں غیرِ حُسن
چاہیے یوسف ہمارے خواب کی تعبیر کو

راست بازوں کو نہ کج طبعوں سے کیوں کر ہو گُریز
رابطہ دم بھر نہیں رہتا کماں سے تیر کو

کیا ستم صبحِ شبِ وصل اُس موذن نے کیا
ہو گیا بسمل میں سُن کر پہلی ہی تکبیر کو

ہیں جو عالی منزلت، اُن کو نہیں تزئیں سے کام
کس نے دیکھا ہے منقش کعبے کی تعمیر کو

آسماں پر ان دنوں رہنے لگا تیرا دماغ
چاہیے رنگِ شفق ظالم تری تصویر کو

کون اِس وادی میں ہو اہلِ فنا کا سدِّ راہ
کیا تعلّق ہے کفن سے، خارِ دامن گیر کو

سو رمز کی کرتا ہے اشارے میں وہ باتیں
ہے لطف خموشی میں تکلّم سے زیادہ

معشوق سے اُمیدِ وفا رکھتے ہو ناسخ!
ناداں کوئی دُنیا میں نہیں تم سے زیادہ

قتل عالم کو کرے گا حُسن اپنا دیکھ کر
ہے بجائے تیغ، دستِ تیغ زن میں آئنہ

ہیں وہی آزاد ناسخ! ہے نہ گھر جن کا نہ در
چوکھٹا لگتے ہی بند ہوتا ہے رسن میں آئنہ

کیوں نہ داغِ عشق سے ہو دُور، خامی طبع کی
پُختہ ہوتے ہیں ثمر خورشید کی تاثیر سے

ہے یہ پاسِ بختِ خوابیدہ کہ زلفوں کی طرح
غُل کبھی برپا نہیں ہوتا مری زنجیر سے

عاریت جو شے ہے، حاجت اُس سے برآتی نہیں
پَر تو ہیں، پر کب اُڑا جاتا ہے از خود تیر سے

فاش ہو باغِ جہاں میں رازِ دل، ممکن نہیں
سیکھے ہیں طرزِ فغاں ہم بُلبُلِ تصویر سے

ہے نکوکاری عبث، اے بانیِ بنیادِ ظلم
فائدہ حجاج کو کیا، کعبے کی تعمیر سے

ہے ریاضِ فکرِ ناسخ کی جو شادابی یہی
لکھنؤ میں آئے گی روحِ غنی، کشمیر سے

بگڑتے جاتے ہیں لاکھوں، ہزاروں بنتے جاتے ہیں
جہاں میں رات دن جاری خدا کا کارخانہ ہے
کہیں ہے فوقِ بُلبُل شاخِ گُل پر دستِ جاناں کو
کہ اِس میں طائرِ رنگِ حنا کا آشیانہ ہے
کوئی دل، گر نہ ہو دو دن مکدر تو غنیمت ہے
ہوا کو ایک دن آخر غبار اپنا اُڑانا ہے

حقارت سے نظر کرتے ہو کیا چاکِ گریباں پر
نہ سمجھو مفلسی، ہم عشق بازوں کا یہ بانا ہے

یں وہ ہوں مُردۂ بےکس کہ میری قبر کے اوپر
بنی ہے برق جھالر، ابرِ رحمت شامیانا ہے
ہوا ثابت، جو دیکھا اژدہا و گنج کو باہم
جو موذی ہیں، ہمیشہ اُن کے قبضے میں خزانا ہے

اجل سر پر کھڑی ہے، خوابِ غفلت میں زمانا ہے
چھپر کھٹ کے عوض لازم جنازے کا بنانا ہے
نکلتا ہے جو ہر گل زر بکف گلزارِ عالم میں
خدا جانے، زمیں میں دفن یہ کس کا خزانا ہے!
نہ دے اے جوشِ بدمستی بہت ترغیبِ گستاخی
خجالت یار سے ہوگی، کبھی تو ہوش آنا ہے
اشارہ آمد و رفتِ نفس کا ہے یہی ہر دم
بدن میں دم جو آیا ہے، مقرر اس کو جانا ہے
کمی ہوتی نہیں نقدِ سخن کی یاں کبھی ناسخ!
ازل سے اپنے قابو میں معانی کا خزانا ہے

یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے
دگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے
یہ رنگ سینہ خراشی میں اب ہے ناخن کا
کہ جیسے سُرخ شفق میں ہلال رہتا ہے

نہ ترکِ صحبتِ احباب کیجیو ناسخ گرا جو برگِ شجر، پائے مال رہتا ہے

ٹھوکر اک پائے حنائی سے لگا کر گُل رُخو!
پھول کوئی میری تربت پر چڑھایا چاہیے

چہرۂ جاناں ہے مصحف اور میں بیمار ہوں
وار کر اُس پر سے پانی اب پلایا چاہیے

دل کو خواہش ہے کہ طفلانِ حسیں گھیرے رہیں
آپ کو اِن روزوں دیوانہ بنایا چاہیے

جس کے ہاتھ آیا خزانہ، قصد رکھتا ہے یہی
مثلِ فوّارہ جہاں میں سر اُٹھایا چاہیے

داغِ فرقت زیست بھر، سوزِ جہنّم بعدِ مرگ
اِن بتوں کو کس توقّع پر خدا یا چاہیے

طالبِ زینت نہیں رنگینیِ بے ساختہ
پنجۂ مرجاں کو کیا مہندی لگایا چاہیے

کون سا خورشید آج اپنا چراغِ خانہ ہے
بزم میں باہم ہجومِ ذرّہ و پروانہ ہے

پانو میں کانٹے چُبھے ہیں، پیرہن ہے چاک چاک
باغ میں جو گُل ہے، تیرے عشق میں دیوانہ ہے

دم نہیں باقی کسی میں تیری صورت دیکھ کر
بزمِ خوباں باجوششِ حیرت سے اک بُت خانہ ہے

ہے وہ گلشن داغ ہائے یاس سے سینہ مرا
مرہمِ زنگار جس میں سبزۂ بیگانہ ہے

عازمِ گل گشت وہ غارت گرِ گلشن ہے کیا!
آمد و رفتِ نسیمِ صبح بے تابانہ ہے

بعد مر جانے کے، عاشق بھی نہیں رہتے ہیں پاس
کوئی بھی بالینِ شمعِ مُردہ پر پروانہ ہے؟

اِس زمیں میں ناسخ اب مستانہ پڑھیے چند شعر
ہے بغل میں شیشۂ مے، ہاتھ میں پیمانہ ہے

پھر بہار آئی، کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش میں جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے
ہر بگولے میں عیاں اک لغزشِ مستانہ ہے
گردشِ چشمِ غزالاں، گردشِ پیمانہ ہے
ابر ہے، صحنِ چمن ہے، ساقیِ مستانہ ہے
ہر طرف کو خندۂ برق و گل دیوانہ ہے
میرے یوسف کی خریداری، عزیزو ہے محال
نقدِ جاں ہے اُس کی قیمت، نقدِ دل بیعانہ ہے
ہر کسی نے کی فریبِ دوستی میں دشمنی
میری شمعِ تربت پر، موجِ ہوا پروانہ ہے
ہے نشانِ شمعِ روشن ہر چراغِ چشمِ غول
ہو چکا ہے بارہا آباد جو ویرانہ ہے

دیکھتے تھے کل جنھیں آنکھوں سے ہم اے غافلو
آج اُن کا اپنے کانوں کے لیے افسانہ ہے
محو ایسے خانۂ رنگیں میں مہماں ہو گئے
یہ نہیں ثابت کسی پر، کون صاحب خانہ ہے
محفلِ عیشِ جہاں کا ہے دلا! کیا اعتماد
نشۂ مے خواب، آوازِ غنا افسانہ ہے
شہر دم میں ہوتے ہیں آباد جن کے حکم سے
ایک دن اُن کے لیے بھی گوشۂ ویرانہ ہے
آج ہے جس کے قدم سے رونقِ باغِ جہاں
کل وہی رخصت بہ رنگِ سبزۂ بیگانہ ہے
گرچہ بیداری میں اب ہیں دیدۂ نظارہ باز
پر کبھی یہ ماجرا، اک خواب کا افسانہ ہے
اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافلو!
اس کی باتوں پر نہ جاؤ، ناسخ اک دیوانہ ہے

لالہ و گل کا جوش ہے، بلبلوں کا خروش ہے
فصلِ وداعِ ہوش ہے، موسمِ ناو نوش ہے
صدقے ہو تیری چال پر کیوں نہ نسیم ہر سحر
نقشِ قدم سے رہ گذر، دامنِ گُل فروش ہے
ذکرِ نزاکتِ بتاں، ہے جو چمن کے درمیاں
موجِ نسیم ہے زباں، گُل کا سو بہ رنگِ گوش ہے

رنگ ہے اس کے جسم پر گل سے کہیں زیادہ تر
آئے برہنہ گر نظر، سب کہیں سرخ پوش ہے

دیکھتے ہیں جدھر کو ہم، پیشِ نظر ہے وہ صنم
کہتے ہیں جس کو سب حرم، خانۂ بُت فروش ہے

شکل نہیں نظر پڑی، آیا نہیں پیام بھی
برسوں ہوئے کہ ایک سی حالتِ چشم و گوش ہے

ناسخ! قول ہے بجا حضرتِ میر دردؔ کا
حُسن بلائے چشم ہے، نغمہ وبالِ گوش ہے

دوست کہتے ہیں اُسے، ساتھ جو دے آفت میں
شمع کے جلتے ہی، پروانہ نہ کیوں کر جل جائے

جب نہ تب نالۂ سوزاں نے جلا خانۂ دل
نہ ہوا یہ کہ کسی غیر کا بھی گھر جل جائے

آتشیں چہرہ ہے ہر شاہدِ مضموں ناسخ
کیا عجب، گر مرے اشعار کا دفتر جل جائے

ہم سبک دوشوں سے طے ہوتی ہے راہِ دیرِ عشق
رشتۂ زنار، دوشِ برہمن پر بار ہے

کیا نزاکت ہے کہ بوئے عطر سے ہے بے دماغ
رنگ مہندی کا، کفِ نازک بدن پر بار ہے

کیوں سبک کرتا ہے واں لے جا کے اے بے چین دل
میرا ہونا، اُس کی ساری انجمن پر بار ہے

یاس نے مجھ کو عطا کی رنجِ نقصاں سے نجات
برق غم گیں ہو، جو کشتِ آرزو پامال ہے
اسفلوں سے دولتِ دُنیا کو الفت ہے کمال
دیکھو، تا زیرِ زمیں ہم راہِ قاروں مال ہے

منع کی ہے مے پرستی کس کی چشمِ مست نے
غنچۂ گُل کی گلابی تک جو چکنا چور ہے
تنگ آ کر جب کہا میں نے کہ مر جاؤں کہیں
بدگماں سمجھا کہ اس کو اشتیاقِ حور ہے
کر تماشائے جہاں سے پہلے اپنی آنکھیں بند
دیکھنا اُس کا اگر ناسخ تجھے منظور ہے

خیالِ یار میں دل شادماں ہے
نہیں ہے غم جو نظروں سے نہاں ہے
مسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے
تماشا ہے، تہِ آتش دھواں ہے
تصورِ سیم تن کا دل میں، ہے گنج
خیالِ مارِ کاکل پاسباں ہے
نقاب اُلٹی گلِ عارض سے اُس نے
گلِ خورشید کی بھی اب خزاں ہے
ستارے جھڑتے ہیں جو کفشِ پا کے
زمیں، فیضِ قدم سے، آسماں ہے
بہ رنگِ طائرِ رنگِ حنا ہوں
کفِ پائے حسیناں، آشیاں ہے
غزل اک اور پڑھیے اِس زمیں میں
کہ سب مشتاقِ بزمِ دوستاں ہے

ہمارا ہر نفس اک بادباں ہے
روانہ کشتیِ عمرِ رواں ہے
معطر آتشِ گُل کا دُھواں ہے
کہ مُنہ پر گیسوئے عنبر فشاں ہے
دہن ہے غنچۂ گلزارِ فردوس
کہ اک عالم کی نظروں سے نہاں ہے
کروں کیا احتیاطِ جسمِ خاکی
غبارِ توسنِ عمرِ رواں ہے

قیامت، پائے مالِ جلوۂ رفتارِ دل بر ہے
جو اس کا نقشِ پا ہے، پنجۂ خورشیدِ محشر ہے

قیامت کیوں نہ ہو، جس دم چڑھائے آستیں قاتل
صفائے ساعدِ سیمیں، بیاضِ صبحِ محشر ہے

رہا بے تاب و نالاں زندگی بھر وادیِ غم میں
خداوندا! جرس شاید مرے طالع کا اختر ہے

بلائے عشق سے بھاگوں نہ کیوں کر گور کی جانب
برائے طفلِ ترسیدہ، پناہ آغوشِ مادر ہے

شفا تدبیر سے کیا ہو گی مجھ بیمارِ ہجراں کو
کہ آبِ زندگی، بے یار، مجھ کو آبِ خنجر ہے

قریب آیا ہے شاید جلوہ گاہِ ناز اے ناسخ
فروزاں پانو کا ہر آبلہ مانندِ اختر ہے

جی میں ہے، خارِ بیاباں، جائے مژگاں دیکھیے
زلفِ جاناں کے عوض، شامِ غریباں دیکھیے

کھائیے کیوں داغ معشوقانِ گُل رخسار پر
مُدّعا ہے جی بہلنے سے، گلستاں دیکھیے

کرتے پھریے کیوں کسی کے مصحفِ رُخ پر نگاہ
صُبح سے تا شام بیٹھے اِس سے قرآں دیکھیے

کر چکے اقلیمِ وحشت میں بہت جوش و خروش
چند مدت عالمِ شہرِ خموشاں دیکھیے

ہو چکیں وہ عشق کے غم میں گریباں چاکیاں
اپنے غم میں گور کا چاکِ گریباں دیکھیے

جلوہ گاہ اُس کا ازل سے یہ دلِ بےتاب ہے
جس کے آگے آفتاب، اک کرمکِ شب تاب ہے

فکر ہے تعمیر کی جو اِن دنوں ہم کو، مگر
اِس خرابے کی طرف پھر آمدِ سیلاب ہے؟

تا بہ کے اِس کی کشاکش کی ہے ایذا، دیکھیے
ہر نفس خنجر ہے، لیکن خنجرِ بےآب ہے

داغ ہو سر پر، گلے میں طوق، بیڑی پانو میں
کچھ تو ہو اسباب، آخر عالمِ اسباب ہے

ہوں گی بند آنکھیں تو سمجھو گے کہ بیداری یہ ہے
دیکھتے ہو کھول کر آنکھیں جو تم، یہ خواب ہے

رنج دیتے ہیں فراقِ یار میں اسبابِ عیش
چاندنی جو ہے مرے ویرانے کو سیلاب ہے

کس بُتِ سیمیں بدن کا آج ہے دل میں خیال
سلکِ اشک آنکھوں میں مثلِ سبحۂ سیماب ہے

اشتیاق ایسا ہے آبِ تیغِ قاتل کا مجھے
مضطرب ہر زخم مثلِ ماہیِ بےآب ہے

پوچھ اے ناسخ نہ کچھ میری اُداسی کا سبب
آپ ہیں دن رات حیراں ہوں، ہوا ہے کیا مجھے

قفس کی طرح ہیں دل چاک ہم اسیروں کے نہیں پہنچتے جو نالے بھی ہم صفیروں کے

زلف کے مضموں سراسر ہیں مرے دیوان میں
تارِ سُنبل، رشتۂ شیرازۂ اوراق ہے
گُل ہے غنچے میں نہاں، بو سے معطر ہیں دماغ
پردۂ دل میں ہے، لیکن شہرۂ آفاق ہے

کہ رہا ہے باغ میں ہر گُل زبانِ حال سے
مبتلائے خارِ غم رہتا ہے جو زردار ہے
وہ بُتِ کافر ہے گُل دستہ ریاضِ حُسن کا
رشتۂ گُل دستہ، بالائے کمر زنّار ہے
درد سے ہوتی ہے پیدا خاک ساروں کی دوا
زخم کو جا دے سگے، سبزہ، مرہمِ زنگار ہے

نہ نقطِ چاہ مجھے قامتِ دل دار کی تھی
شُلِ منصور، زمانے کو ہوس دار کی تھی
تھا مجھے بالِ ہُما ہر پرِ کاہِ دیوار
جھانو جس دن مرے سر پہ تری دیوار کی تھی
آشنا تھا نہ کبھی پائے نگہ کانٹوں سے
رات دن دید مجھے گلشنِ بے خار کی تھی
جن دنوں گلشنِ رخسار ترا تھا بے خار
کون بُلبُل تھی کہ خواہش جسے گُل زار کی تھی

چہرہ آتش کدہ، ابرو تھے سو محرابِ حرم
گردن آگے ترے خم کافر و دیں دار کی تھی

صلح نامہ جو لکھا تیرے خطِ مشکیں نے
نہ رہی جنگ، جو کچھ میری اور اغیار کی تھی

تھی نہ اُمّید رہائی کی دلِ ناسخ کو
لاکھ زنجیر ترے گیسوِ خم دار کی تھی

داغِ دل چمکا خیالِ عارضِ پُر نور سے — ہو گیا روشن چراغ اپنا، چراغِ طور سے
چاند کو اپنا مشابہ دیکھ کر کہنے لگا — ہم نے عکسِ آئنہ گردوں پہ دیکھا دور سے
کب ہوا مارِ سیہ کے سامنے روشن چراغ — بھاگتا ہے آفتاب، اپنی شبِ دیجور سے

طالبِ دیدار جس کا ہے، دلا، وہ تجھ میں ہے — جلوۂ برقِ تجلّی تھا شرارِ طور سے
منعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں — مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل، زنبور سے
وعدۂ دیدار اُس نے حشر پر رکھا تو ہے — طالعِ خفتہ بھی ہوں بیدار لیکن صور سے
غور سے ٹیکے کی سرخی کچھ نظر آتی نہیں — رنگِ پیشانی صنم کا، مل گیا سیندور سے
بانٹ لے کوئی کسی کا درد، یہ ممکن نہیں — بارِ غم دُنیا میں اُٹھواتے نہیں مزدور سے
دیکھتا ہوں جب کلام اُس کا، بہت آتا ہے یاد — اُنس تھا مجھ کو نہایت ناسخِ مغفور سے

گرتی ہے بجلی جو عکسِ عارضِ پُر نور سے — آئنہ کیا تو نے بنوایا ہے سنگِ طور سے
جل گیا ہے دل مرا برقِ رُخِ پُر نور سے — یہ صنوبر، کم نہیں رُتبے میں نخلِ طور سے
دم بخود ہوں تیرے ماتھے کا یہ ٹیکا دیکھ کر — لال ہوتی ہے زبانِ ناطقہ سیندور سے

دیکھنا اے اہلِ عبرت، انتقامِ آسماں
بنتے ہیں جاروبِ گدا، خاکِ سرِ فغفور سے

جو نظر آیا حرم میں، دَیر میں دیکھا وہی
ناسخ، اپنی آنکھیں روشن ہیں خدا کے نور سے

زمیں کو کر دیا رشکِ فلک تیری سواری نے
ہزاروں ماہِ نَو نکلے نشانِ نعلِ توسن سے

جو دے خورشید سے نسبت تجھے، وہ تیرہ باطن ہے
کہ روشن عالمِ دل ہے ترے رُخسارِ روشن سے

زباں یوں میری دُزدانِ سخن نے بند کر دی ہے
کہ رستے بند ہو جاتے ہیں جیسے خوفِ رہزن سے

مسی آلودہ لب سے جب کُھلے دانت اُس کے ہنسنے میں
نظر آنے لگیں بیلے کی کلیاں برگِ سوسن سے

کشش ہے ہم اسیروں ایسی اپنے عشق کی، دیکھو
کھنچی آتی ہے بوئے گُل قفس کو صحنِ گلشن سے

میں سر دینے کو حاضر ہوں، اُسی کو شرم آتی ہے
جُھکی ہے گردنِ قاتل، زیادہ میری گردن سے

دل مرا مرگِ شبِ فرقت میں ایسا شاد ہے
شیونِ یاراں، مجھے شورِ مبارک باد ہے

قدر دانی، جور سے خالی نہیں ہے دہر میں
دستِ گل چیں سے گلوں پر باغ میں بیداد ہے

دور ہے یار اپنی نظروں سے، تصور میں قریب
گھر تو ویراں ہے، مگر بزمِ خیال آباد ہے

بندھ گیا مجھ کو تصوّر کس قدِ موزوں کا آج
جو بگولا ہے، مری نظروں میں اک شمشاد ہے

جی نہیں بچتا نظر آتا شبِ فرقت میں آج
کہکشاں تلوار ہے اور آسماں جلّاد ہے

شوقِ گل زارِ فنا میں میرے مرغِ روح کو
چار دیوارِ عناصر، خانۂ صیّاد ہے

سر جھکائے ہوں تواضع سے گنہ گاروں کی طرح
ہر کوئی اِس پر بھی میری جان کو جلّاد ہے

کیا سمجھ کر کوے مہ رویاں میں پھر جاتا ہے تو
آفتِ عشقِ گذشتہ تجھ کو ناسخ یاد ہے

شبیہِ قامتِ موزوں، مرا ہر ایک مصرع ہے
نہیں دیواں، تصاویرِ حسیناں کا مرقّع ہے

ترا زیور جو سارا، اے پری پیکر، مرصّع ہے
تو اُس کے وصف میں بالکل کلام اپنا مرصّع ہے

ترے رُخسارِ تابندہ کے مضموں کا جو مطلع ہے
بعینہٖ آفتابِ صبحِ محشر کا وہ مطلع ہے

پڑا جوشِ صفا سے عکس جو اُس پرستاروں کا
گماں ہے ایک عالم کو کہ جسم اُس کا مرصّع ہے

پس از مُردن بھی ظاہر ہے دغل اِن اہلِ دنیا کا
وگرنہ کیا سبب جو اِن کے روضوں پر ملمّع ہے

کہاں بیت الصنم میں ہر کسی کو بار ملتی ہے
وہ بیت اللہ ہے سارے جہاں کا جس میں مجمع ہے

مرا خامہ، ہے باغِ فکر میں شجرہ رباعی کا
مری طبعِ رواں، اشعار کی بحروں کا منبع ہے
اگر تقطیعِ شعر اُس سے کوئی پوچھے تو حیراں ہو
یہ شیخِ شہر سارے شاعروں میں جو مقطع ہے

روشن جو عکسِ رُخ سے یہ جامِ شراب ہے
کہتے ہیں، دستِ ماہ میں اب آفتاب ہے
حیرت سی ہے طلسمِ جہاں دیکھ کر مجھے
یارب، مرا خیال یہ ہے یا کہ خواب ہے
کانٹے جو کر رہے ہیں غریبوں سے کاوشیں
اِس ظلم سے ہر ایک بیاباں خراب ہے
کتنے لگے ہیں زخم، ملے بوسے کس قدر
قاتل سے ہم سے حشر کے دن یہ حساب ہے
ہم مے کشوں کو غم نہیں مرنے کا محتسب!
فردوس میں بھی سنتے ہیں نہرِ شراب ہے
یوسف کی طرح کھینچ ہی لاؤں گا دیکھنا
ظالم! مرا خیال، زلیخا کا خواب ہے

فکر سے میں نہیں خالی غمِ جاناں میں کبھی
کبھی زانو پہ مرا سر ہے گریباں میں کبھی
قافلہ کیا کہ جرس کی بھی صدا دہشت سے
نہیں آتی مرے پُرہول بیاباں میں کبھی

دہر میں غرقِ گنہ کون مرا ثانی ہے
موجِ مے مجھ کو بجائے خطِ پیشانی ہے
لشکرِ مورچۂ خط ہو کہیں کبر شکن
ہر پری چہرہ کو دعوائے سلیمانی ہے
ٹکٹکی لگ گئی، جس سمت ہوا منہ اپنا
مثلِ آئینہ یہاں عالمِ حیرانی ہے
اس قدر کر گئی پرواز زمانے سے تمیز
کہ ہر اک تاجِ خروس، افسرِ سلطانی ہے

گو زنجیروں سے ڈھانکو، عوضِ چادرِ گُل
تھا میں دیوانہ، مری روح بھی دیوانی ہے
کم شبِ مہ سے شبِ تار نہیں ہے ناسخ
اب تصور میں جو وہ چہرۂ نورانی ہے

مردمِ دُنیا مرے حق میں سگِ دیوانہ ہیں
کاٹنے کو دوڑتے ہیں صورتِ انساں مجھے

حیرت سے اشک چشم کے باہر نہ ہو سکے
دریا بھرے رہے، پہ مژہ تر نہ ہو سکے
حاصل ہو غیرِ گوشۂ تجرید کیا کمال
بن سیپ، قطرہ آب کا گوہر نہ ہو سکے
تقلید سے ہوا شرفِ ذات کب حصول
آئینہ ساز، مثلِ سکندر نہ ہو سکے
کیوں کر کروں میں اپنی طرف اُس کا دل رجوع
جب اختیار اپنے ہی دل پر نہ ہو سکے
رکھو کسی طرح تو سروکار مہرباں!
کرتے رہو جفا ہی، وفا گر نہ ہو سکے

گو مرا تابوت، یاروں کو وبالِ دوش ہے
گور تو میرے لیے کھولے ہوئے آغوش ہے

خوب بزمِ دہر میں آتش زبانی کر چکے
آج کل اپنا چراغِ زندگی خاموش ہے

مرگ کے ساماں مہیا ہیں، قضا کی دیر ہے
ماتھ واں تلوار پر ہے، یاں لہو کا جوش ہے

چاند پر یہ خاک ہے، یا اُس کے چہرے پر بھبھوت
بدلی میں سورج ہے، یا محبوب کمبل پوش ہے

انسان دل میں کہتے ہیں حسرت سے مرتے دم
تنہا عدم کو ہم چلے، دنیا میں سب رہے

ہر موجِ بوریا، رگِ خوابِ گراں ہوئی
راحت میں عمر بھر مرے پائے طلب رہے

کی ہے خیالِ زلف میں سب زندگی بسر
گویا کہ ہم جہان میں بس ایک شب رہے

تاریخ ہر ایک ملک کی ہوتی ہے اور رسم
آزردہ وضعِ دہر سے ہم بے سبب رہے

جب وادیِ وحشت میں گزر میرا ہوا ہے
ہر ایک بگولا پئے تعظیم اُٹھا ہے

نادان ہیں، ہوتا ہے گماں جن کو شفق کا
گلشن کا ترے رشک سے یہ رنگ اُڑا ہے

وہ سنگ دل اک روز ہوا صاف نہ مجھ سے
کہتے ہیں غلط، سنگ سے آئینہ بنا ہے

ہر دم ہے تمنّا کہ کہیں تن سے جُدا ہو
جس دن سے مرا سر ترے قدموں سے جُدا ہے

کب ہوا ساکن کماں کے خانۂ رنگیں میں تیر
رد کے کیا نقش و نگارِ عالمِ فانی مجھے

تھا میں عاشق، جب غرورِ حُسن دنیا میں نہ تھا
سنگ میں آئینہ تھا، ہے جب سے حیرانی مجھے

کرتی ہے ضائع عبادت کو سیہ کاری مری
سجدے میں حاصل نہیں جز داغِ پیشانی مجھے

فراقِ یار میں نفرت ہے مجھ کو بادہ خواری سے
کہیں زاہد نہ کردے متہم پرہیز گاری سے

زمیں پر پانو کس انداز سے رکھتا ہے اے ظالم
رواں ہے ساتھ ہر نقشِ قدم تک بے قراری سے

اگر ہے آبرو انساں میں ہوگی شجاعت بھی
بُرش تلوار میں ہوتی ہے پیدا آب داری سے

سیہ رو کیوں کہا کرتا ہے ہم مستوں کو اے زاہد
کہ اپنے چہرے پر رہتی ہے سُرخی بادہ خواری سے

زبانِ شمعِ سوزاں سے یہ مصرع گرم سُنتا ہوں
سرِ عُریاں ہے اِس محفل میں بہتر تاج داری سے

جب تلک گردش ہے اِس کو اک جہاں گردش میں ہے
مثلِ فانوسِ خیالی، آسماں گردش میں ہے

کیوں نہ ظالم کی مدد کرتا رہے دورِ فلک
تیزیِ شمشیر کی خاطر فساں گردش میں ہے

تم جو یاں شب باش ہو، پھرتا ہے کیا نالاں رقیب
خوابِ آسایش میں ہم تم، پاسباں گردش میں ہے

جو کہ ہیں صاحب سخن، اک دم نہیں اُن کو قرار
ہے زباں بالفرض اگر معجز بیاں، گردش میں ہے

سعی سے فارغ نہیں، ہرچند ہوں سیر اہلِ حرص
ہے دہن لب ریز نعمت سے، زباں گردش میں ہے

چہرہ ہوا ہے غیرتِ گل، آفتاب سے
خوش بو میں ہے زیادہ پسینا، گلاب سے

خط ہے جو گردِ عارضِ جاناں، عجب نہیں
کیوں کر نہ نکلیں خطِ شعاعِ آفتاب سے

کب تک غبارِ جسم سے آلودہ میں رہوں
کرتا ہوں غسل خنجرِ قاتل کے آب سے

کرتے تھے سیرِ مصحفِ رُخ، زلف میں پھنسے
دشتِ خطا میں جا پڑے راہِ صواب سے

فرقت قبول، رشک کے صدمے نہیں قبول
کیا آئیں ہم، رقیب تری انجمن میں ہے

ہیں بے نصیب صحبتِ جاناں سے ایک ہم
پروانہ بزم میں ہے تو بلبل چمن میں ہے

سونا سگندھ کیوں نہ کہوں تجھ کو اے پری
رنگت سنہری اُس پہ یہ خوش بو بدن میں ہے

دونوں کا کر چکا ہوں میں اے ناسخ امتحاں
تیشہ میں مہر ہے، نہ وفا برہمن میں ہے

رُتبہ میرے خانۂ ویراں کا ایسا ہے بلند
آسماں کہتے ہیں جس کو، میرے گھر کا بام ہے

آ گئے وحشت شہر سے تھی، اب ہے دُنیا سے گریز
تھا وہ آغازِ جنونِ عشق، یہ انجام ہے

ہو گئی صبحِ شبِ وصل اُس کے جاتے ہی سیاہ
آفتاب اپنی نظر میں اک چراغِ شام ہے

کوچہ و بازار میں کہتے ہیں مجھ کو دیکھ کر
ہے یہی آتش زباں، ناسخ اسی کا نام ہے

شق کروں سینے کو، تا داغ نمایاں ہووے
ایسے خورشید سے صبحِ شبِ ہجراں ہووے
کب سے یہ دل میں تمنا ہے کہ تو قتل کرے
ہاتھ میں میرے ترا گوشۂ داماں ہووے
سُرخ رو گُل کی روش تب ہوں میں دیوانوں میں
پانو میں خار چبھیں، چاک گریباں ہووے

کچھ عدم کا بھی خیال اے دل تجھے یاں چاہیے
گو عزیزِ مصر ہے، پر یادِ کنعاں چاہیے
دم بہ دم کہتی ہے میری کشتیِ عمرِ رواں
مجھ کو آبِ خنجرِ قاتل کا طوفاں چاہیے

ہے ازل کے روز سے برہم ہماری بزمِ عیش
لی ہے مینائے فلک نے گردش اپنے جام سے
کیا شبِ فرقت کے صدموں سے ہے نسبت موت کو
مر گیا ہے جو کوئی، سوتا ہے وہ آرام سے

اے شیخ دگبر! سبحہ و زنار توڑ دے
پر، دل کسی بشر کا نہ زنہار توڑ دے
ہم وحشیوں کے پانو کو کانٹوں سے کیا ہے اُنس
ہاتھوں سے بھی گلوں کے عوض خار توڑ دے
ہے کس کو فہم زمزمہ ہائے صریر کا
بس عندلیبِ کلک کی منقار توڑ دے
یاروں کی ہم سے دل شکنی ہو سکے کہاں
یاں پاس ہے، نہ خاطرِ اغیار توڑ دے
خر مہرے سے بھی گوہرِ مضموں کی کم ہے قدر
وہ وقت ہے کہ کلکِ گہر بار توڑ دے
ہم جورِ چشمِ یار سے دم مارتے نہیں
یعنی روا ہے کب دلِ بیمار توڑ دے

ناسخ بہ قولِ افصحِ ہندوستاں، کبھی
زاہد کا دل، نہ خانۂ خمّار توڑیے

روز مرگِ آرزو ہے، تا بہ کے غم کیجیے
تا کجا دستِ دعا کو وقفِ ماتم کیجیے

جو بخیلوں سے ملا، وہ قابلِ ایثار ہے
داغِ حسرت کو چراغِ گورِ حاتم کیجیے

مے کدے میں دیکھیے چل کر طلسماتِ جہاں
موجِ مے کو آج خطِ ساغرِ جم کیجیے

ہر طرف مصروف ہیں زاہد نمازِ صبح میں
گردنِ مینا کو بھی لازم ہے اب خم کیجیے

جذبۂ معشوق سے افتادگی ہے بال و پر
کیوں نہ حسرت کی نگاہیں سوئے شبنم کیجیے

دوستی وہ ہے نہ ہو جس میں غرض کا شائبہ
روزِ روشن میں چراغِ مُردہ کا غم کیجیے

حالِ ناسخ کی پریشانی سے کیا نسبت اُسے
آپ اپنی زلف کو کتنا ہی برہم کیجیے

کوچہ ہائے زخمِ دل تیرے تجلّی گاہ ہیں
داغ جو سینے میں ہے، اس میں تری تصویر ہے

شاخِ گل ہے قدّ و قامت، برگِ گُل رُخسارِ یار
خندۂ گل جنبشِ لب، بوئے گُل تقریر ہے

کوئی کچھ کہتا ہے دنیا میں کوئی کہتا ہے کچھ
معنیِ اشعارِ مہمل، خواب کی تعبیر ہے

بُتِ ہستی کو جو توڑیں تو خدا آئے نظر
آتشِ سنگ کی صورت وہ ہے پنہاں ہم سے

لفظِ رنگیں میں یہ ہیں معنیِ روشن پنہاں
ہو سکا بس یہی وصفِ لب و دنداں ہم سے

ہے طلب میرے دلِ نالاں کی زلفِ یار کو
خانۂ زنجیر کو بھی پاسباں درکار ہے

کر رہا ہے خانقہ تعمیر جواب شیخِ شہر
کیا اُسے ایماں فروشی کو دُکاں درکار ہے

حُسن کے عالم میں کچھ اسباب کی حاجت نہیں چشمِ گویاے صنم کو کیا زباں درکار ہے

حمت اِن غافلوں کو رات دن فکرِ عمارت ہے
کریں عبرت کہ کیا کیا قصر و ایواں ہو گئے خالی

ہزاروں بے گناہوں کا ہوا خوں، کچھ نہیں پروا
ہوا قاتل کو غم اِس کا کہ زنداں ہو گئے خالی

صدف کی طرح تب مُنہ ہم نے کھولا تشنہ کامی سے
برس کر جب کہ سارے ابرِ نیساں ہو گئے خالی

نخلِ بُریدہ ہوں، مجھے کیا برگ و بار سے
شاخِ شکستہ ہوں، نہیں مطلب بہار سے

ہر ایک کی صدا ہے قدم روندتی ہے دل
بہتر ہے ہم کو یاس ترے انتظار سے

اُس گُل کے دیکھتے ہی مرا رنگ اُڑ گیا
آئی خزاں یہ میرے چمن میں بہار سے

دستِ تہی ہیں سوختنی زیرِ آسماں
کیوں کر نہ نکلے آتشِ حسرت چنار سے

ہم صفیر، اِس باغ کی کیسی ہوا ناساز ہے
طائرِ رنگِ چمن تک مائلِ پرواز ہے

ہیں روانہ کوے قاتل سے عدم کو قافلے
بسملوں کی ہچکیوں میں، زنگ کی آواز ہے

فصلِ گُل ہے چار دن، ایّام توبہ ہیں مدام
عمر بھر اے مَے کشو بابِ اجابت باز ہے

سُرمگیں آنکھیں ہزاروں مل گئی ہیں خاک میں
جو زباں ہے خار کی صحرا میں. بے آواز ہے

چونک اُٹھے خوابِ لحد سے سُن کے سوداؔ یہ غزل
شاعری ہرگز نہیں ناسخؔ، فقط اعجاز ہے

نور افشاں اس قدر اُس کا خرامِ ناز ہے
چادرِ مہتاب گویا فرشِ پا انداز ہے

زاہدا، کیا ڈھونڈھتا پھرتا ہے کعبے کی کلید
آ، درِ میخانہ، قُفلِ بابِ توبہ باز ہے

لکھتے ہی، اُڑتے ہیں اطرافِ جہاں میں اپنے شعر
طائرِ معنی کو کاغذ، شہپرِ پرواز ہے

جلوۂ معشوق کے باعث ہیں عاشق آپ ہی
آتشِ گُل، بُلبلوں کا شعلۂ آواز ہے

جسم کو جی ہے گراں، سینے کو ہے دل بھاری
ہے وہ درپیش مجھے عشق کی منزل بھاری

اہلِ غفلت کا ہے ہر جزوِ بدن تک دشمن
ہاتھ بھی، خواب میں ہے سینے کو اک سِل بھاری

یہ درا اے دلِ نالاں سے صدا آتی ہے
ناقۂ روح کو ہے جسم کا محمل بھاری

قیدِ غفلت میں بھلا قطع ہو کیا راہِ طلب
پانو میں خوابِ گراں کی ہے سلاسل بھاری

ہے گراں آج مرے ماہ کو گرمی سے نقاب
کیا ہی تجھ پر ہے یہ رات اے مہِ کامل بھاری

بارِ غم، بحرِ محبت کے شناور کو نہیں
دھارے میں ہلکی ہے کشتی، لبِ ساحل بھاری

نہ سُنا پر نہ سُنا، کیا ہی گراں گوش ہیں گُل
ہو گئی نالوں سے آوازِ عنادل بھاری

ہے بیت ہی میں معنیٔ بیتِ خیال بند
نزدیک ہے بہت، جسے سمجھے ہیں دُور ہے
معشوق سے، ہے دل کے عوض طالبِ وفا
ناسخ بھی عاشقوں میں بڑا بے شعور ہے

باغ میں سُن کے مری زمزمہ پردازی کو
آشیاں کر گئے مرغانِ خوش الحاں خالی
صاف ہوں خاک کدورت سے یہ دل ہائے خراب
کس طرح ریگِ رواں سے ہو بیاباں خالی
ایک چھوٹا، تو ملی دوسرے کو قیدِ حیات
کبھی ہوتا نہیں یہ خانۂ زنداں خالی
میں ہوں کیا چیز دلا، خاک نشیں، مورِ ضعیف
کر دیا موت نے اورنگِ سلیماں خالی
قابلِ گوہرِ مقصود نہیں رنگیں طبع
عین دریا میں رہا پنجۂ مرجاں خالی
کون دونوں میں، خدا جانے، خدا کو ہو پسند
کفر بھی چاہیے، لازم نہیں ایماں خالی

لالہ کو ربط داغ سے ہے، گل کو خار سے
دنیا میں جو حسین ہے، بے امتیاز ہے

زنہار اختیار نہیں صلح و جنگ میں
عالم تمام بازیٔ شطرنج باز ہے

آتا ہے رحم کافر و مومن کے حال پر
بُت محوِ ناز ہے تو خدا بے نیاز ہے

روشن ہوا یہ محفلِ عالم میں شمع سے
پروانے سر نہیں جسے، وہ سرفراز ہے

ممکن نہیں ہے بے مے و معشوق زندگی
واعظ! اب اضطرار میں سب کچھ جواز ہے

ہوئی ہے چاک کیوں یہ آتے ہی فصلِ بہاری کے
بجائے گُل بکھر سی تھی مرے تارِ گریباں سے!
کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جُدا رہتا ہے انساں سے

دو چار حزیں پہنچیں اگر اور بھی ہم سے
ہستی کی طرف مُنہ نہ کرے کوئی عدم سے
گُل پھولے ہیں میرے قلمِ فکر سے جیسے
یوں گُل نہ شگفتہ ہوں کسی گُل کے قلم سے
رکھتا ہے فلک سر پہ، بنا کر شفق اُس کو
اُڑتا ہے اگر رنگِ حنا تیرے قدم سے

مشتاق سب ہیں بدر سے افزوں ہلال کے
مرنا قبول، پر مجھے دُنیا نہیں قبول

دنیا میں قدرداں نہیں صاحب کمال کے
غم مرے اُٹھیں گے مجھ سے نہ اِس پیرزال کے

ہمت اگر نہیں فلکِ دوں کو، کیا ہے غم
یاں لب ہی آشنا نہیں حرفِ سوال کے

کیا بارِ زلف ہے کمرِ یار پر وبال
ایذا اٹھائی کس نے نہ موذی کو پال کے

آرام کیا کہ جس سے ہو تکلیف اور کو
پھینکو کبھی نہ پانو سے کانٹا نکال کے

بجا ہے، گر وصال اغیار کو ہے، مجھ کو ہجراں ہے
کہ دنیا کافروں کو باغ ہے، مومن کو زنداں ہے

کیا ہے دو جہاں سے مجھ کو آزاد اک اشارے میں
نگہ تیری پئے قطعِ تعلق، تیغِ براں ہے

کیا کرتے ہیں خونِ آرزو گنجِ قناعت میں
ہمارے پاس جائے گنجِ زر، گنجِ شہیداں ہے

چمکتی ہے جو ریت اکثر، نشاں ہے مہ جبینوں کا
جسے ہم روندتے پھرتے ہیں، یہ سب خاکِ انساں ہے

شبِ فرقت میں کرتا ہوں نظر جس دم ستاروں پر
کسی کی گور پر میں جانتا ہوں، یہ چراغاں ہے

اٹھے جاتے ہیں روشن دل پیاپے یوں زمانے سے
ہوا چلتی ہے گویا تند اور اس میں چراغاں ہے

تیری نوک اے خارِ غم دیکھیں تو کیسی تیز ہے
توسنِ عمرِ رواں کو حاجتِ مہمیز ہے

وحشتِ دل بے طرح امسال شور انگیز ہے
وحشیو! نوروز ہے یا روزِ رستاخیز ہے

بادۂ عشرت سے خالی زیست بھر ساغر رہا
آج کیوں کر جام میری عمر کا لب ریز ہے

کوہ کن کو فی الحقیقت اپنے سر سے کام تھا
کوہ پر تیشہ لگا دیکھا کہ کیسا تیز ہے

باغ میں گل، بن، ہیں گل دستے مزاروں کے تمام
خاک میں کیا کیا ہی گل رخسار پنہاں ہو گئے
گلشنِ عالم میں ہوں وہ عندلیبِ نغمہ سنج
زاغ، جس کے زمزمے سن کر خوش الحاں ہو گئے
گلشنِ رخسارِ جاناں سے ہوئی رخصت بہار
صورتِ برگِ خزاں عاشق پریشاں ہو گئے
ارمغانِ داغِ سودا لے چلے سوئے وطن
دو دن اِس وحشت سرا میں ہم بھی مہماں ہو گئے
جتنے ہیں داغِ جنوں، ہیں سکۂ شاہانِ حسن
کشورِ دل میں رواں کس کس کے فرماں ہو گئے
جس جگہ تھے قصر و منظر، بن گئیں گوریں تمام
شہر جو آباد تھے، شہرِ خموشاں ہو گئے
رات دن رہتی ہے ناسخ ہم کو از خود رفتگی
آہ جب سے عاشقِ رفتارِ جاناں ہو گئے

جوہرِ ذاتی بشر کا ہے جسے کہتے ہیں عشق
سیکھتا ہے کون فنِ عاشقی اُستاد سے
بادشاہی کیجیے چل کر کسی ویرانے میں
چاہیے اُلفت گدا کو کوچۂ آباد سے

تہلکہ ہے جان کو ہر آن زیرِ آسماں
جلد نکلا چاہیے اِس قصرِ بے بنیاد سے

طائرِ رنگِ حنا ہاتھوں سے اڑ سکتا نہیں
چھوٹ آئے مرغِ دل کس طرح اس صیاد سے
اغنیا کو ہے یہاں حسرت، فقیروں کو ہے عیش
بانغ کے مزدور ہی اچھے رہے شداد سے
تھا ازل سے مجھ کو تا وقتِ ولادت خوابِ عیش
کھل گئیں آنکھیں مری شورِ مبارک باد سے
کوہ کن بھی ہو گیا تیری محبت میں فقیر
ہے مشابہ زخمِ تیشہ، قشقۂ آزاد سے

صحنِ گلشن میں ترے آتے ہی اے رشکِ بہار
حشر برپا ہے شکستِ رنگ کی فریاد سے
کعبہ ہے سنسان، صنمخانے میں مستوں کا خروش
کون ویرانے کو جائے خانۂ آباد سے
نظمِ شیریں ہے دلوں میں، نقشِ شیریں سنگ میں
ہے قلم اپنا زیادہ تیشۂ فرہاد سے
پھرتے پھرتے سب اتر آیا ہے تلووں میں لہو
خارِ صحرا ہیں زیادہ نشترِ فصاد سے
ضعف سے ہے طائرِ دل، طائرِ رنگِ حنا
کب یکایک چھوٹتا ہے پنجۂ صیاد سے
تاب سننے کی نہیں، بہرِ خدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فریاد سے

جوان دل ہے تو پیری نہیں ہے مانعِ عیش
سفیدی بالوں کی، ہے جوشِ ماہتاب مجھے

وصل کی دولت ملی جذبِ دلِ بے تاب سے
کیمیا ہم نے بنائی ہے مگر سیماب سے
ہے مسرت راحتِ دنیا سے، غفلت کے سبب
کون خوش ہوتا ہے بیداری میں عیشِ خواب سے
آسماں کے پاس ساماں عیب پوشی کا نہیں
کب کسی کا ستر ہو گا چادرِ مہتاب سے
خاکِ کوے یار ہے ناسخ مرے تن پر لباس
کام کیا مجھ کو حریر و اطلس و کمخاب سے

چشمِ جاناں اور ہے، چشمِ غزالاں اور ہے
وضعِ انساں اور ہے، ترکیبِ حیواں اور ہے

سیرِ مقتل مت سمجھ گُل گشت، اے نازک مزاج
باغ و بُستاں اور ہے، گنجِ شہیداں اور ہے

یہ میسّر ہے، وہ دیکھیں ہو میسّر یا نہ ہو
کوے جاناں اور ہے، گُل زارِ رضواں اور ہے

خاک جنت میں لگے گا بعدِ مُردن دل مرا
نازِ غلماں اور ہے، اندازِ انساں اور ہے

اِس میں ہے داغِ فراق، اے صبح، اُس میں آفتاب
یہ گریباں اور ہے، تیرا گریباں اور ہے

دل سے ہے کاوش اِسے، تلوؤں سے ہے اُس کو خلش
خارِ مژگاں اور ہے، خارِ مغیلاں اور ہے

فرق ہے شاہ و گدا میں قولِ شاعر سے یہی
شیرِ قالیں اور ہے، شیرِ نیستاں اور ہے

میری قسمت کی وطن میں یہ سیہ بختی ہے
لاکھ ہو گردشِ ایام، یہ حاضر ہے مدام
خانہ ویراں مجھے کہتا تھا ہر اک اے ناسخ

تیرگی مانگتی ہے شامِ غریباں مجھ سے
اُنس رکھتی ہے نہایت شبِ ہجراں مجھ سے
اب تو آباد ہوا خانۂ زنداں مجھ سے

خدا نے زر کیا پیدا اُڑا دینے کو دُنیا میں
زمیں میں جس کو پنہاں کرتے ہیں، وہ گنجِ قاروں ہے

نہ ہو ادنا کو تا حسرت کبھی اعلا کے رُتبے سے
زمیں آرام سے ہے، رات دن گردش میں گردوں ہے
سیہ مستوں کی ہے رفتار میرے کلک میں ناسخ
دمِ فکرِ سخن مجھ کو خیالِ چشمِ مے گوں ہے
بلندی میں مثالِ آسماں گر قصر تھا تو کیا
اجل کے ہاتھ سے زیرِ زمیں آخر فریدوں ہے

آئنے کو دوست رکھتے ہیں جہاں کے خوب و زشت
دل ہوا جب صاف، بس عالم سے جھگڑا پاک ہے
جس قدر نشّہ زیادہ، اُتنی ہی سرگشتگی!
ایک صورت پر ازل سے گردشِ افلاک ہے
ساکنِ دل تو ہوا، آنکھوں کو ترساتا ہے کیوں
جس قدر دل صاف ہے، ویسی نگہ بھی پاک ہے
وسعتِ مشرب ہے تو رندو! گنہ سے کیا ضرر
دامنِ دریا ہزار آلودگی سے پاک ہے

اسفل و اعلا جو ہیں، مل جائیں گے سب خاک میں
آسماں اِس رُتبۂ عالی پہ زیرِ خاک ہے
مثلِ نکہت جسم اُس کا ہے لطافت سے نہاں
غم نہیں، ٹکڑے بہ رنگِ گُل اگر پوشاک ہے

چھوڑ دے میرا گریباں، تا نہ رسوا ہو کوئی
دستِ وحشت! یہ کسی کا پردۂ ناموس ہے

کسی نے تیرِ دُزدیدہ نگہ سے دل کو مارا ہے
لہو روتی ہیں آنکھیں، رازِ پنہاں آشکارا ہے

بسر کی عمر مثلِ شمعِ ماتم، بزمِ ماتم میں
چراغِ گور شاید اپنے طالع کا ستارا ہے

ہمیں اے نخل بندِ باغِ عالم، موسمِ گُل میں
دکھانا ساغرِ گُل، بادہ خواری کا اشارا ہے

گلُوں کا اور میرا فصلِ گُل میں ایک عالم ہے
چُبھے ہیں خار پاؤں میں گریباں پارا پارا ہے

تو وہ گُل ہے کہ گزرا باغ میں جس جس خیاباں سے
تو آوازِ شکستِ رنگ سے گُل نے پکارا ہے

یہ مضمونِ غم و شادی و مرگ و زیست ہے لاشے
جہاں وہ بیت ہے جس میں سراسر استعارا ہے

ہمارے حکم سے یہ تخم ریزی ہے مضامیں کی
کہ ناسخ ہر زمینِ شعر میں اپنا اجارا ہے

اب تک جو اُس کی ہیں وہی وعدہ خلافیاں
آگاہ کیا نہیں مرے حالِ تباہ سے
ہر روز روزِ ہجر ہے، ہر شب شبِ فراق
نفرت ہوئی یہاں کے سفید و سیاہ سے

عزلت گزیں ہو، تا رہے تجھ سے زمانہ صاف
اُٹھتی ہے رہ رووں کے سبب گرد، راہ سے

اُس کی ہر دم کی نصیحت سے میں تنگ آیا ہوں
کاش ناصح سے بھی آنکھ اُس نے لڑائی ہوتی

ابرِ رحمت سے تو محروم رہی کشت مری
کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی

پاس یارِ جانی ہے، بادہ ارغوانی ہے
شغلِ شعر خوانی ہے، عالمِ جوانی ہے

چال کس پری رو کی وقتِ فکر یاد آئی
آج کچھ بہت اپنی طبع میں روانی ہے

منہ سے گر لگے مینا، آبِ خضر ہو پینا
پی کے ایک دم جینا، عمرِ جاودانی ہے

آئنہ یہ دوراں ہے، اِس میں عکسِ جاناں ہے
آپ اپنا حیراں ہے، آپ اپنا ثانی ہے

سُننے والے روتے ہیں، ایسی نیند سوتے ہیں
اُن پہ نوحے ہوتے ہیں، اپنی وہ کہانی ہے

عمرِ خضر تک نا سخ، ہے ثبات ہم کو بھی
گو ہرِ سخن میں یاں آبِ زندگانی ہے

کیا سیاہی اور سُرخی لالہ دار آنکھوں میں ہے
چشمِ بد دُور، آج اے ساقی، بہار آنکھوں میں ہے

کر کے وعدہ شب کے آنے کا، نہیں آیا جو یار
بے قراری دل میں ہے اور انتظار آنکھوں میں ہے

جامِ مے خنداں جو بے ساقی نظر آیا مجھے
جوش پر کیا گریۂ بے اختیار آنکھوں میں ہے

کر دیا بسمل اُسے جس سے ہوا قاتل دوچار
یہ نگہ ہے یا کہ تیغِ آب دار آنکھوں میں ہے

بے سبب پیری میں، غافل، کم نظر آتا نہیں
توسنِ عمرِ رواں کا یہ غُبار آنکھوں میں ہے

ہیں جو سالک، جانتے ہیں اپنے دشمن کو بھی دوست
آبلوں کو فائدہ کرتی ہے کاوش خار کی
کرتے ہو تعمیر اوروں کے لیے قصر و رواق
غافلو! تم کو ملی قسمت مگر معمار کی
شوقِ مَے نے کر دیا اس درجہ مجھ کو بے حواس
محتسب سے راہ پوچھی خانۂ خمار کی
بے سبب توڑا نہیں خُم محتسب نے ساقیا
روح شاید تشنۂ مے تھی کسی مے خوار کی

فلک پر چاند کو مجنوں نے جب دیکھا تو یہ سمجھا
کہ لیلا جھانکتی ہے مُنہ نکالے اپنے محمل سے

جو کیفیت بھری ہے تیری آنکھوں میں، کہاں اُس میں
کہ نرگس کی کٹوری، ساقیا! اک جامِ خالی ہے

ہزاروں قامتِ بالا کے مضموں کیوں نہ ہوں موزوں
رسا تا عالمِ بالا ہماری طبعِ عالی ہے

کیوں سوزشِ غم ہے دلِ صد چاک میں آتنی
کم ہوتی ہے ایوانِ ہوادار میں گرمی
بل کھانے سے ہر زلف میں عالم ہے دُھویں کا
شعلے کی طرح ہے ترے رُخسار میں گرمی
کس برقِ جہاں سوز کے موزوں ہوئے اوصاف
ناسخ نہ ہو کیوں کر مرے اشعار میں گرمی

توڑیں جو پانو، تو بھی جہاں میں پھرے حریص
بیٹھا گیا نہ کونے میں تیمور لنگ سے

ہوتی ہیں اور عشق میں رسوائیاں مری
ثابت ہوا ہے مجھ کو اجل کے درنگ سے

گزرے جو باغ میں وہ سوارِ سمندِ ناز
گُل گوں بھی آگے بڑھ نہ سکے گُل کے رنگ سے

بادِ بہار سی ترے گُل گوں کی چال ہے
ٹھوکر کے ساتھ پھول نکلتے ہیں سنگ سے

خوب موزوں ہم سے وصفِ قدِ بالا ہوگیا — عالمِ بالا تلک اپنا بول بالا ہوگیا
خوش ہوا بھولے سے گر دل، غم وہیں یاد آگیا — قہقہہ ہونٹھوں تلک پہنچا کہ نالا ہوگیا

مرتبہ کم، حرصِ رفعت سے ہمارا ہوگیا — آفتاب اونچا ہوا ایسا کہ تارا ہوگیا
ہے تصورِ نوکِ مژگاں کا جو ہر دم سامنے — دیدۂ گریاں ہمارا اب ہزارا ہوگیا
باعثِ چاکِ کتاں ہوتا ہے جلوہ ماہ کا — واں چھپا وہ ماہ، یاں دل پارا پارا ہوگیا
ایک درہم اور داخل گنجِ قاروں میں ہوا — پست ایسا میرے طالع کا ستارا ہوگیا
شوق سے عزمِ بیابانِ جنوں اب کیجیے — دانۂ زنجیر سے بھی استخارا ہوگیا
یہ ترقی پر ہے ہر دم حسن اُس محبوب کا — ماہِ کامل، زیر پائی کا ستارا ہوگیا

دیکھ کر موجِ ہوا کو کہتے ہیں غربت میں ہم — بوریا اُڑتا ہے اپنے خانۂ برباد کا
کوئی غنچہ ہے، کوئی گل ہے، کوئی پژمردہ ہے — دیکھتے ہیں ہم تماشا گلشنِ ایجاد کا
محوِ عشق ایسا ہوں، کرتے ہیں اگر اعدا بھی ظلم — شبہہ ہوتا ہے اُسی محبوب کی بیداد کا
شرم سے رکھتے ہیں پوشیدہ پری زاد آپ کو — جب سے آشوبِ جہاں ہے حسن آدم زاد کا
رہ گذر ہے راہ گیروں کی گرفتاری کو دام — حلقہ ہے ہر نقشِ پا گویا مرے صیاد کا
جو ملے بے خود مجھے، سمجھوں ترا عاشق اُسے — خود فراموشی نشاں ہے یار تیری یاد کا

رنگِ عشرت باغِ عالم میں نظر آتا نہیں
گُل کو گُل چیں کا خطر، بُلبُل کو غم صیاد کا
کون سی طرزِ سخن ہے جو اسے آتی نہیں
کیوں نہ ہو، شاگرد ہے ناسخ ہر اک استاد کا

قدح لیے ہوئے گُل مثلِ بادہ خوار آیا
خزاں چمن سے گئی، موسمِ بہار آیا
تمام عمر یوں ہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا
خبر کرے کوئی زاہد کو، آئے بہرِ مدد
شکستِ توبہ کو پھر موسمِ بہار آیا
دیے فلک نے مرے سر کو کتنے ہی گُلِ داغ
گلہ نہیں کوئی پاؤں تلے جو خار آیا

نکلے شرار، فرقتِ ساقی میں جامِ مے
شیشے کو میرے بخت نے پتھر بنا دیا
تجھ پر چمن میں عکسِ زرِ گُل جو پڑ گیا
جوشِ صفا نے سونے کا زیور بنا دیا
ہم نے نظارۂ دُرِ دندانِ یار سے
تارِ نظر کو رشتۂ گوہر بنا دیا

پہلے ہر قطرہ عرق کا صاف گوہر ہو گیا
بعد ازاں گوہر، فروغِ رُخ سے اختر ہو گیا
اُس پری نے جب اُٹھایا سنگ مجھ دیوانے پر
آتشِ رنگِ حنا سے صاف اخگر ہو گیا
تجھ کو جس گُل پیرہن نے اک نظر دیکھا کبھی
نکہتِ گُل کی روش جامے سے باہر ہو گیا
ہے عجب راہِ عدم، جو بھی چلا اس راہ میں
اک قدم میں، پیش قدموں کے برابر ہو گیا
کر گئی پرواز رنگت تیرے ہونٹوں کے حضور
پیش ازیں جو لعل تھا اب سنگِ مرمر ہو گیا

خیال میں بھی اگر خواب سے دو چار ہوا
شبِ فراق سے میں کیا ہی شرمسار ہوا
کیا ہے میں نے اِس انداز سے گریباں چاک
کہ سینہ دشمنِ بے درد کا فگار ہوا

کارواں بادِ بہاری کا رواں ہو جائے گا
ایک دن یہ باغ پامالِ خزاں ہو جائے گا

آبجو میں پڑگیا ہے آج اُس گُل کا جو عکس
باغ میں ہر غنچۂ گل، عطر داں ہو جائے گا

رفتہ رفتہ اپنے در تک وہ صنم آنے لگا
سجدہ گاہِ خلق سنگِ آستاں ہو جائے گا

حرص سے زاہد یہ کہتا ہے، جو گر جائیں گے دانت
کیا کشادہ بہرِ رزق اپنا دہاں ہو جائے گا

یار جب مجھ جاں بہ لب کو بھیجے گا پیغامِ وصل
دیکھنا، پیغام بر، معجز بیاں ہو جائے گا

فکر کر موقوف ناسخ، جی نہیں لگتا ترا
پھر طبیعت کا کسی دن امتحاں ہو جائے گا

ہے تصوّر مجھے ہر دم تری یکتائی کا
مشغلہ آٹھ پہر ہے یہی تنہائی کا

میری آنکھوں نے تجھے دیکھ کے وہ کچھ دیکھا
کہ زبانِ مژہ پر شکوہ ہے بینائی کا

قدم اغیار کا رکھنا ہو گوارا کیوں کر
تیرے در پر ہے مجھے شغل جبیں سائی کا

ہجرِ جاناں سے رہائی کا قرینا ہو گیا
سہل مرنا ہو گیا، دشوار جینا ہو گیا

جو پری پیکر نظر آیا، وہ ہے زر کا مطیع
ہر درم، گویا سلیماں کا نگینا ہو گیا

کیوں نہ ہو ایسا عروجِ نشۂ مے ساقیا
تا فلک موجِ ہوا کا کیا ہی زینا ہو گیا

گڑ گئے گُل بُن زمیں میں دیکھ کر بوٹا سا قد
تھا کفِ گُل میں جو زر، گویا دفینا ہو گیا

رنگِ پاں سے، سبز سونا بن گئے کُندن سے گال
مبتذل تشبیہ ہے: سونے پہ مینا ہو گیا

فرقتِ ساقی میں ایسے بن گئے ہم پارسا
محو خاطر سے خیالِ جام و مینا ہو گیا

جب مرے دل کو اضطراب ہوا — سارے عالم میں انقلاب ہوا
نامہ بر خط کے پُرزے چُن لایا — یہی حاصل اُسے جواب ہوا
روزنِ تاریک پھر ہوا روشن — پھر ہر اک ذرّہ آفتاب ہوا

ایک عالم ہے مری غفلت و ہشیاری کا
خواب دیکھا نہ کبھی بخت کی بیداری کا

کام خوں ریزی ہے اُس یوسفِ بازاری کا
جان بیچے، جو کرے قصد خریداری کا

رحمتِ حق ہے سبب میری گنہ گاری کا
ابر کرتا ہے اشارہ مجھے مے خواری کا

معنیِ شعلۂ آواز میں شک ہو جس کو
دیکھے عالم مرے نالوں کی شرر باری کا

شہسواری کا جو اُس چاند کے ٹکڑے کو ہے شوق
چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری کا

رحم دل ایسے ہیں ہم صید گہِ عالم میں
غم ہوا طائرِ مضموں کی گرفتاری کا

روئے گل رنگ اگر حوض میں ہو عکس فگن
طورِ فوّارے میں ہو رنگ کی پچکاری کا

اپنے نالوں کا ابھی ظاہر اثر ہو جائے گا
شور سُن کر اُس پری کا بند در ہو جائے گا

تا بہ خانہ پہنچ جاؤں، تو بچ جاتی ہے جاں
ساغرِ مے، پیشِ تیغِ غم، سپر ہو جائے گا

تیغِ قاتل! شاخِ صندل سے اثر میں کم نہیں
سر کٹے گا دُور میرا دردِ سر ہو جائے گا

ناسخ! اپنے دن پھریں گے دشتِ غربت میں اگر
آبلہ ہر ایک تلوے کا، گہر ہو جائے گا

تیرے جاتے ہی، ہوا رنگِ چمن ہو جائے گا
برگِ گل جو ہے وہ برگِ یاسمن ہو جائے گا

ایسی حیرت زا تری آنکھیں ہیں اے صیادِ خلق
دشتِ آہو صاف نرگس کا چمن ہو جائے گا

مے کدے تک محتسب کو، مے کشو آنے تو دو
دیکھ کر پیمانے کو، پیماں شکن ہو جائے گا

کیوں اُلجھتا ہے تجھے ناسخ فراقِ یار کا
ایک دن ناداں! فراقِ روح و تن ہو جائے گا

ساقی! مے وصال میں عالم ہے نور کا
چمکا دے چاندنی میں پیالہ بلور کا

دیوان کیوں بھروں نہ حسینوں کے ذکر سے
قرآن میں بھی ذکر ہے غلمان و حور کا

کرتا ہوں رنجِ دوریِ جاناں میں فکرِ شعر
مضمون کس طرح مجھے سوجھے نہ دور کا

جھک جھک کے شیشے ملتے ہیں، ہنس ہنس کے جام سے
یہ مے کدہ، مقام نہیں ہے غرور کا

ناسخ! اگے جو سنگ، تو ستودانے یہ کہا
ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

جی لیتی ہے وہ زلفِ سیہ فام، ہمارا
بجھتا ہے چراغ آج سرِ شام، ہمارا

ایسا کوئی گم نام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

اوّل تو نہ قاصد کو رہے کوئے صنم یاد
پہنچے تو فراموش ہو پیغام ہمارا

نکہتِ گُل کی روش، اے فلکِ ناہنجار
تو نے اُس گُل سے چھڑا کر مجھے برباد کیا
ایک دل، دو کی سمائی ہو بھلا کیا ناسخ
خود فراموش ہوا میں، جو اُسے یاد کیا

قمریو! باغ میں وہ غیرتِ شمشاد آیا
بندۂ سرو ہو تم، کرنے کو آزاد آیا

گُل کو جب دیکھا، وہ گل گوں پیرہن یاد آگیا
یاسمن کو دیکھ کر، اُس کا بدن یاد آگیا

آج مجھ کو دشتِ وحشت میں وطن یاد آگیا
بوئے گُل کو بعدِ بربادیٔ چمن یاد آگیا

گھر بناؤں خاک اِس وحشت کدے میں ناصحا!
آئے جب مزدور، مجھ کو گورکن یاد آگیا

ہوں وہ وحشی، زیست بھر بھولا رہا پوشاک کو
جب کفن پہنا تو مجھ کو پیرہن یاد آگیا

ہوں جو یوں خاموش اے ہمدم! نہیں تجھ سے خفا
آج مجھ کو وہ حسینِ کم سخن یاد آگیا

ہوگیا جوشِ جنوں، چلنے لگی بادِ بہار
لالۂ نو دیکھ کر، داغِ کہن یاد آگیا

لائی نادانی سے بوئے گل صبا جو صبح صبح
کیا مزاجِ کاکلِ شب رنگ برہم ہوگیا

آسماں نے بخل پر اس درجہ باندھی ہے کمر
چشمۂ خورشید تک محتاجِ شبنم ہوگیا

چھوڑ کر چہرے پہ زلفیں معجزہ اس نے کیا
ایک پل میں بڑھ گئی رات اور دن کم ہوگیا

مے سے روشن رہے ایاغ اپنا
گُل نہ ہو ساقیا چراغ اپنا

کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے
نہیں پاتے کہیں سراغ اپنا

آپ میں آئیں، جائیں یار کے پاس
کب سے ہے ہم کو انتظار اپنا

بے خودی میں یہ کون یاد آیا
خود بہ خود دل ہے بے قرار اپنا

بعد مرنے کے آج اے ناسخ (ق) عزم ہے سوے کوے یار اپنا
آگے آگے ہوئی ہے روحِ رواں پیچھے پیچھے چلا غبار اپنا

مُردے جی اٹھے، جوں ہی طاق سے مینا اُترا رند کہنے لگے کعبے سے مسیحا اترا
یوں فلک سے کبھی اترے نہ شہابِ ثاقب جس طرح بام سے اپنے وہ بھبھوکا اترا

میرا رقیب، کشتہ ہے ابروے یار کا طعمہ ہوا ہے خونِ شفق، ذوالفقار کا
ہر دم خیال ہے رخِ تابانِ یار کا بس ہے یہی چراغ شبِ انتظار کا
جب سے پڑا ہے عکس کسی گل عذار کا صاف آئنے میں طور ہے صبحِ بہار کا
او محتسب! سمجھ کے تو شیشے کو توڑیو دل بھی نہ ٹوٹ جائے کسی بادہ خوار کا
برسات ہے پلا مئے گل رنگ ساقیا! ہندوستاں میں ہے یہی موسم بہار کا

اُس نے جو پونچھا پسینا روے عالم تاب کا بن گیا رومال کونا چادرِ مہتاب کا
نسبت اے گل کیا ہے تیری چشمِ خواب آلود سے طور نرگس میں ہے میرے دیدۂ بے خواب کا
کم بضاعت جتنے ہیں کرتے ہیں وہ جوش و خروش توڑ ہوتا ہے کسی دریا میں کب سیلاب کا
ہے صفا حاصل، تو بے تابی بھی ہے اے دل ضرور صاف ہو کر آئنہ محتاج ہے سیماب کا
پستیِ طالع نے یہ گردش دکھائی ہے ہمیں ہے گڑھا دریا میں اے ناسخ سبب گرداب کا

نفع فیاضی سے کم ظرفوں کو کیا مثلِ چراغ گھر تو روشن کر دیا پر خود سیہ رو ہو گیا
رنگِ گل اڑتے ہی سوے عارضِ جاناں چلا طائرِ نکہت، اسیرِ دامِ گیسو ہو گیا

گُل کو جب دیکھا، تری تصویر کا دھوکا ہوا
بولی جب بُلبل، تری تقریر کا دھوکا ہوا

ہوں وہ بے خود، خونِ پا سے جب ہوئی زنجیر لال
خاکِ صحرا پر مجھے اکسیر کا دھوکا ہوا

بھاگے ہم زاہد! تری مسجد کو زنداں جان کر
دیکھ کر تسبیح کو، زنجیر کا دھوکا ہوا

صاف دیکھی تیری صورت، اپنی صورت دیکھ کر
آئینے پر، صفحۂ تصویر کا دھوکا ہوا

کیوں نہ ہو جلوۂ خورشید سے سایے کا وجود
کیا ترے چہرے سے ہو زلفِ گرہ گیر جدا

دمِ بُلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا جوں ہی سَن سے نکل گیا
لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازے پر
شعلہ سا ایک جیبِ کفن سے نکل گیا
سنسان مثلِ وادیِ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

ساقی! شرابِ صاف کی تاثیر دیکھنا
جامِ سفال، ساغرِ بلّور ہو گیا
دل دے کے، آ گیا ترے قابو میں اے صنم
میں اپنے اختیار سے مجبور ہو گیا
ناسخ! ہے اس جہان کا دارِ غرور نام
معذور ہے، اگر کوئی مغرور ہو گیا

تیرے حضور زہرۂ مہ، آب ہو گیا
شب، چاندنی میں عالمِ سیلاب ہو گیا

پھاڑا جو اُس نے دستِ حنائی سے خط مرا
ہر پرزہ، برگِ لالۂ شاداب ہو گیا
آنا ترا وہ راتوں کا یاد آگیا جو ہاے
مہتاب کو میں دیکھ کے بے تاب ہو گیا
انساں دوچار ہو کے نہ کیوں کر ہو بے قرار
آئینہ تجھ کو دیکھ کے، سیماب ہو گیا

نیک ہیں گلشنِ ایجاد میں کم، بد ہیں بہت
خار پھولوں سے کہیں ہوتے ہیں افزوں پیدا
کر لیا پریوں کو تسخیر سنا کر اشعار
مثلِ ناسخ نہیں اب صاحبِ افسوں پیدا

ہے کیا ہی اثر خوبیِ ابرو کے بیاں کا
تلوار سے کم کاٹ نہیں میری زباں کا
پُر کیوں نہ ہو حسرت سے مرا دامنِ خالی
گُل کیا، کوئی کانٹا نہ ملا باغِ جہاں کا
یوں ہو کے سبک دوش جو چلنے کو ہو تیار
کچھ تو کہو ناسخ کہ ارادہ ہے کہاں کا؟

شیشۂ مے ٹوٹتے ہیں آج محفل میں بہت
تو نے دل توڑا ہے کیا ساقی! کسی مے خوار کا؟
اس قدر کافر بتوں کا میں نے نظّارہ کیا
طَور ہے تارِ نظر میں رشتۂ زنّار کا

ثنائے ابروِ خم دار ہے بیاں اپنا
سوائے تیغ نہیں کوئی ہم زباں اپنا
اسیر ہم جو قفس میں ہیں تو ہمارے عوض
ہوائے باغ میں اڑتا ہے آشیاں اپنا
حواس و ہوش اُڑیں، دیکھ کر کہیں اُس کو
وہ یوسف آئے تو ہو کارواں رواں اپنا

سفر چلے ہیں، تو اُس بُت سے مل لیں اے ناسخ! خدا ہی جانے کہ جانا ہو اب کہاں اپنا

نہیں ممکن کہ کوئی خارِ تعلق چبھ جائے
اپنے دامن کو سمیٹے ہے بیاباں اپنا
ذکرِ گُل کا تو ہے کیا، انجمن آرائے ازل!
کہ نہ اُلجھا کبھی کانٹے سے بھی داماں اپنا

ہر ورق بالِ پری سے ہے مشابہ ناسخ!
کہ پری زادوں کے ہے وصف میں دیواں اپنا

پوچھنے کی نہیں سیلابِ بلا کو حاجت
جانتا ہے مرے ویرانے کو وہ گھر اپنا
خاک پر لوٹتے ہیں فرقتِ محبوب میں ہم
چاندنی ہے شبِ مہتاب میں بستر اپنا
اتنی مدت سے ہوں میں وادیٔ وحشت میں خراب
کہ وطن جاؤں تو پاؤں نہ کبھی گھر اپنا

کہاں وطن سے ہوں میں خانماں خراب جُدا
ہوا بیاض سے کب شعرِ انتخاب جُدا!
ہوئی ہے کیا ہی تعین سے دُشمنی باہم
نہیں اگرچہ حباب اور موجِ آب جُدا
پہنچ رہیں گے برابر ہی حشر میں بد و نیک
رہِ خطا سے کہاں ہے رہِ صواب جُدا

روئے جاناں ہے پھول نسریں کا
ہاتھ میرا ہے ہاتھ گل چیں کا
طبعِ رنگیں ہی کافی ہے ناسخ
شوق کب ہے لباسِ رنگیں کا

ایک کا ہو دشمنِ جانی نہ کیوں کر دوسرا
عرصۂ امکاں نہیں، میدان ہے یہ جنگ کا

طُرفہ ہولی کھیلتا ہے باغ میں وہ رشکِ گل
ہے گُلال اُس کو، اُڑانا روئے گُل سے رنگ کا

کب زمانہ اپنی نیرنگی دکھاتا ہے مجھے
ہے دلا! جلوہ کسی محبوب کے نیرنگ کا

دن نہیں، یہ ہے اُسی کے روئے روشن کا خیال
شب نہیں، یہ ہے تصوّر کاکُلِ شب رنگ کا

چلا عدم سے میں جبراً، تو بول اٹھی تقدیر
بلائیں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

شگفتہ غنچۂ امیدِ باغ کر اے گُل!
خزاں میں ساتھ نسیمِ بہار لیتا جا

جگر کے ٹکڑے ہیں گُل، لالہ ہے دلِ پُر داغ
مرے چمن سے کچھ اے گُل عذار لیتا جا

لی جان خدا نے، کسی بُت نے نہ کیا قتل
نکلا نہ دمِ مرگ بھی ارمان ہمارا

ہر بیت میں اک شاہدِ معنی کی ہے تصویر
ناسخ! ہے مُرقّع، نہیں دیوان ہمارا

بنے گا ماہِ کامل پرتوِ خورشیدِ عارض سے
گریباں ہے ہلال اُس کی قبائے آسمانی کا

شعار اپنا ہوا ہے بُت پرستی اِن دنوں زاہد!
اثر یہ ہو گیا شاید ہمیں گنگا کے پانی کا

کسی کو صُبحِ دم ہوتی نہیں شب کی سی آسایش
مجھے پیری میں یاد آئے نہ کیوں عالم جوانی کا

دمکتا ہے جو کُندن سا بدن ہر ایک حلقے سے
تری جالی کی کُرتی میں ہے عالم کامدانی کا

پھول جھڑتے ہیں ترے مُنہ سے جو اے رنگیں بیاں
نکتہ چیں آیا تری محفل میں، گُل چیں ہو گیا

رنگِ گُل ایسا اُڑا اُس رشکِ گُل کے سامنے
دامنِ بادِ صبا گلشن میں رنگیں ہو گیا

خانہ بربادی میں بھی ہے اپنی آسایش وہی
پیٹھ بستر ہو گئی ہے، ہاتھ بالیں ہو گیا

کیا ہی تاثیرِ حلاوت ہے لبِ جاں بخش کی
حرف مُنہ سے تلخ بھی نکلا تو شیریں ہو گیا

سبحہ رابگست واز بہرِ کمر زنار ساخت
شغلِ بیدلؔ، اِن دنوں ناسخؔ بھی بے دیں ہوگیا

اِس سے بہتر ہے کہیں عریاں پھرانا اے جنوں
جامۂ ہستی نہایت اب پُرانا ہوگیا

ہے بجائے شعلۂ آواز، شعلہ طُور کا
لن ترانی اُس مغنّی کا ترانا ہوگیا

اُڑ گیا مجھ کو نظر آتے ہی کیا وہ شہ سوار
رشتۂ نظارہ گویا تازیانا ہوگیا

گڑ گئے گلبُن چمن میں رشک سے تیرے حضور
اب زرِ گُل، صاف قاروں کا خزانا ہوگیا

خود فروشی شوق سے کر سرفروشوں کے حضور
عہد اب تیرا ہے، یوسف کا زمانا ہوگیا

پھر وہی ہے زورِ وحشت، پھر وہی جوشِ جنوں
فصلِ گُل آتے ہی کیا ناسخ توانا ہوگیا

پیکِ فرخندہ فال آپہنچا | پھر پیامِ وصال آپہنچا
پھر مبارک ہو صحبتِ ساقی | موسمِ برشکال آپہنچا
چشمِ بے نور، ہو گئی پُرنور | کیا وہ یوسف جمال آپہنچا!
دشت سے کب وطن کو پہنچوں گا | کہ چھٹا اب تو سال آپہنچا
آتے آتے جو پھر گیا ہے خواب | شاید اُس کا خیال آپہنچا

ہمہ تن آبلہ ہوں آتشِ گُل سے اُبلبُل!
پھول مارا جو کسی نے، تو میں پتھر سمجھا

کوئی عاشق کے برابر نہیں دُنیا میں حریص
عمر بھر وصل میں گُزری ہے، میں دم بھر سمجھا

دل نے جس راہ لگایا، میں اُسی راہ چلا
وادیِ عشق میں گُم راہ کو رہ بر سمجھا

عرش کے توڑے ہیں تارے، جائے مضمونِ بلند
آج بارے امتحانِ طبعِ عالی ہو گیا

ہم چلے اپنے وطن کو، ہو کے غُربت میں فقیر
کشتیِ دریوزہ پر ہے عزم گنگا پار کا

ہو نہ برہم، تجھ کو دیتے ہیں جو یوسف سے مثال
بند مُنہ کس نے کیا ہے مردمِ بازار کا

کون ہے کافر جو تیرا محوِ نظّارہ نہیں
بن گیا تارِ نظر رشتہ ترے زنّار کا

کب سے ناسخ کی جستجو تھی مجھے
آج وہ خانماں خراب ملا

تیرے پرتو نے کیا گنگا کو دریا نُور کا
جس نے دیکھا لہر کو، سمجھا وہ شعلہ طُور کا

اُس پری رُو کے کفِ پا میں ہے عالم نُور کا
سنگِ پا کے واسطے منگوائیں پتھر طُور کا

حُسن بھی کیا چیز ہے، زاہد! ذرا انصاف کر
اپنے بندوں کو خدا دیتا ہے لالچ حُور کا

پہلے کر لیتا ہوں گُل اپنے سیہ خانے کی شمع
تب کہیں مضمون پاتا ہوں شبِ دیجور کا

موذیوں پر قہر، یا رب! لطف سے خالی نہیں
کیا مزہ دیتا ہے لُٹنا خانۂ زنبور کا

کیا حسد ہے، اگر اک شب نظر آیا بھرپور
ساغرِ ماہ کا گردوں نے کنارا توڑا

آتشِ رنگِ حنا سے، شمع ہیں سب اُنگلیاں
دستِ جاناں میں مرا مکتوب، پروانہ ہوا

ذکر کیا شب ہائے فرقت میں چراغ و شمع کا
آگ لگنے سے کبھی روشن سیہ خانہ ہوا

جوششِ حیرت سے کسی کو طاقتِ جُنبش نہیں
مجمعِ خوباں ترے آتے ہی بُت خانہ ہوا

تو وہ خورشیدِ قیامت ہے کہ تیرے سامنے
گورا گورا چاند کا مُنہ، سانولا ہو جائے گا

کوئی میرے چاک پیراہن جو کر دے گا رفو
پنجۂ وحشت کو دم بھر مشغلا ہو جائے گا

نقش ہیں تسخیرِ دل کے واسطے، نقشِ قدم
سایہ تیرا اے پری! جادو کا پُتلا ہو گیا

ہے کشاد و بستِ کارِ عاشقاں تیرے ہی ہاتھ
کھل گیا جس دم دریچہ، بند رستا ہوگیا
بن گیا جب بہرِ خود بینی دلِ صاف آئینہ
تھا نہاں اپنی نظر سے میں، سو پیدا ہوگیا

ہم نے دی تیری مانگ سے جو مثال
رتبۂ کہکشاں بلند ہوا
بس سلیمان کا جنازہ بنا
کچھ جو تختِ رواں بلند ہوا
پست آوازِ مدح خواں کی ہوئی
نعرۂ نوحہ خواں بلند ہوا

زمینِ کوچۂ جاناں قدم پکڑتی ہے
جو قصد کرتے ہیں وحشت میں ہم نکلنے کا

گھر اپنا حادثوں سے جو برباد ہوگیا
انبوہِ غم سے ملکِ دل آباد ہوگیا
سودائی ہو کے پھنس گئے زنداں میں گرچہ ہم
دل تو ہر ایک قید سے آزاد ہوگیا

نادان! بندِ عقل سے زنجیر خوب ہے
دانا وہی ہے جو کوئی دیوانہ ہوگیا

ناخنِ فکر سے نادان، تو دل ریش ہے کیا!
مفسدہ کچھ بھی نہیں، مصلحت اندیش ہے کیا!
کر سکے گا نہ خدا بھی جسے غافل! آساں
امرِ دشوار وہ ایسا تجھے درپیش ہے کیا؟
بھول تلخی بھی، اگر یاد نہیں شیرینی
نوش کا شکر نہیں، تو گلۂ نیش ہے کیا

وصف جو موزوں کیے اُس کے سنہرے رنگ کے
خود بہ خود ہر صفحۂ دیوان مُذہب ہوگیا
پھر کسی محبوبِ معنیٰ فہم سے الفت ہوئی
پھر نیا دیوان ناسخ کا مُرتّب ہوگیا

ہے نقش ترا نام پری رو! مرے دل پر
ہے نام تو اچھا، یہ نگینا نہیں اچھا
آنکھیں ہی بَلا لاتی ہیں انسان پر اکثر
اندھے ہی یہاں اچھے ہیں، بینا نہیں اچھا

خونِ جگر اچھا کہ ہمیشہ ہے میسّر
ساقی! مے گل رنگ کا پینا نہیں اچھا
رُخسارِ طلائی نے نکالا ہے عبث خط
سونا ہے سگند اور یہ مینا نہیں اچھا

آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے
مرنا ہی یہاں خوب ہے، جینا نہیں اچھا

کس قدر آشفتہ خاطر ہوں خیالِ زلف میں
جاگنا بھی اِن دنوں خوابِ پریشاں ہوگیا
تیرے تلوے اوروں کے مُنہ سے سوا شفاف ہیں
آئنہ بھی اُن کے آگے صاف جھانواں ہوگیا

جھومتی آتی ہے متوالی گھٹا
ہے سیہ مست آج کی کالی گھٹا
روتے روتے اشک آنکھوں میں نہیں
ایسی برسی، ہو گئی خالی گھٹا

مَل کے مسّی، رُتبہ دانتوں کا بہت کم کر دیا
کیا غضب تم نے کیا، ہیروں کو نیلم کر دیا

زیست بے نظارہ، یارب! ایک دم ممکن نہیں
اُس پری رُو کے بدن کو جانِ آدم کر دیا

ہے تواضع کیا ہی باکیفیت اپنی بزم میں
جب کوئی آیا، سرِ مینائے مے خم کر دیا

رات گھٹتی ہے تو بڑھتا ہے فروغِ آفتاب
حُسنِ رُخ چمکا، جو اُس نے زلف کو کم کر دیا

یہ دلِ نالاں، جو ہے مانندِ شانہ چاک چاک
مثلِ زلف اِس نے مزاجِ یار برہم کر دیا

زخمِ دل کے بھر گئے ابروئے قاتل دیکھ کر
بخت نے میرے لیے خنجر کو مرہم کر دیا

بامِ پردہ ماہ کرتا ہے نظارا صبح کا
آج بارے خوب چمکا ہے ستارا صبح کا

ہو بھڑک جتنی زیادہ، جلد ہے اُتنا زوال
سب ستاروں سے ہے روشن تر ستارا صبح کا

داغ ہے خورشید، پُرزے پیرہن، رنگت سفید
صاف مجھ میں عشق نے نقشا اُتارا صبح کا

کہاں پرواز کی اے ہم صفیرو! میں نے گلشن میں
قفس میں بس پھڑکنے کو ہوئے ہیں بال و پر پیدا

فلک پر مہر و مہ کی طرح رہتا ہے دماغ اُن کا
کیا جن غافلوں نے گردشوں سے سیم و زر پیدا

بلا کے تیغ پیچھے ہے دلا! فضلِ الٰہی بھی
کہ جیسے تیغِ ماہِ نو سے ہوتی ہے سپر پیدا

رہے صندل مبارک تیری پیشانی کو او کافر
یہاں پتھر ہوئے بہرِ علاجِ دردِ سر پیدا

جلد ہو مست، یہی کر رہی ہے شور گھٹا
ساقیا! دیر نہ کر، دیکھ تو ہے زور گھٹا

کوڑے بجلی کے نہ کیوں رعد لگائے پیہم
مے کشو! چادرِ مہتاب کی ہے چور گھٹا

دھوئے واں بال، ہوا یاں دلِ پُر داغ کو وجد
رقص کرتے ہیں اگر دیکھتے ہیں مور گھٹا

دھوپ تو کیا چاندنی پڑ جائے گی تجھ پر اگر
گورا گورا جسمِ نازک، سانولا ہو جائے گا

گرمیِ رخسار سے بیمار ہو گی چشمِ یار
دھوپ کی شدت سے آہو کا ہلا ہو جائے گا

کیسی تخفیف، اے طبیبو! فصلِ گُل آنے تو دو
پھر وہی میرے جنوں کا ولولا ہو جائے گا

لے کے تیغ آفتاب آئی ہمارے قتل کو
ظلم، ناسخ! ہو گیا ہے آشکارا صبح کا

جانبِ رحمتِ حق دھیان ہے بس رندوں کا
شاد ہو جاتے ہیں کیا دیکھ کے مے خوار گھٹا

ہوش بدمستوں کے چلتے ہیں پئے استقبال
جاتی ہے جب طرفِ خانۂ خمّار گھٹا

روئے روشن ہے وہی، ہو گئی گو زلف دراز
بڑھ گئی رات، مگر دن نہیں زنہار گھٹا

گھر سے باہر میرے رشکِ ماہ کو آنے تو دو
چاندنی پر شبہہ ہوگا سایۂ دیوار کا

کرتے ہیں سالک، ترقی سے تنزّل اختیار
جب کہ منزل پر سوار آیا، پیادہ ہو گیا

مری آنکھوں سے کیا نسبت، کہ قطرہ ابرِ نیساں کا
دُرِ نایاب ہو سکتا ہے، آنسو ہو نہیں سکتا

بنا گو سجدہ گاہِ اہلِ ایماں طاق کعبے کا
مگر حاصل مقامِ طاقِ ابرو ہو نہیں سکتا

کمال اے ماہِ کامل تو نے گو پیدا کیا، لیکن
ہلالِ عید ہو سکتا ہے، ابرو ہو نہیں سکتا

نزاکت شاخِ گُل میں ہے کہاں اُس گُل سے ہاتھوں کی
کوئی گل برگ بھی تعویذِ بازو ہو نہیں سکتا

بادۂ عشرت بھلا مینائے گردوں میں کہاں
آتشِ حل کردہ سے پُر ہے ایاغِ آفتاب

ایک دم میں ہے بہار اور ایک دم میں ہے خزاں
سب شفق کہتے ہیں جس کو ہے وہ باغِ آفتاب

حق پرستی کو نہیں چھوڑتے ہم بادہ پرست
ہے نمازِ اوّلِ شب اور شرابِ آخرِ شب

سرخ پوشاک پہن کر وہ سہی قد جو گیا
جل اُٹھے سروِ چمن مثلِ چنار آپ سے آپ

کچھ تری تیغِ جفا کی نہیں تقصیر اے گُل
صورتِ غنچہ مرا دل ہے فگار آپ سے آپ

غیر کا مُنہ ہے کہ لے بوسے ترے او ظالم!
نیل گوں ہو گئے ہوں گے یہ عذار آپ سے آپ

کیا شبِ وصلِ صنم کی چاندنی آتی ہے یاد
روزِ فرقت جب مری دیوار پر آتی ہے دھوپ

وصل کی شب بختِ بد اپنا دکھاتا ہے کمال
میرے گھر میں چاندنی آتے ہی بن جاتی ہے دھوپ

دن گزر جاتا ہے جوں توں، رات کٹتی ہی نہیں
ناگوارا ہجر میں ہے چاندنی، بھاتی ہے دھوپ

کس قدر پُر نور ہے سایہ مرے محبوب کا
چاندنی کی کیا حقیقت ہے کہ شرماتی ہے دھوپ

تمتما جاتا ہے چہرہ چاند سا سورج کی طرح
دم بھر اُس جانِ نزاکت پر جو پڑ جاتی ہے دھوپ

تیرے پرتو سے چمکتے ہیں نجوم و مہر و ماہ
ذرہ ہائے خاک کو جس طرح چمکاتی ہے دھوپ

ہوتی ہے برپا قیامت، مہر و مہ ہوتے ہیں جمع
وصل کی شب ساتھ اپنے چاندنی لاتی ہے دھوپ

بس یوں ہی روزِ قیامت تک رہے گی اب سیاہ
کیا مرے ظلمت کدے میں آ کے پچھتاتی ہے دھوپ

کیا لال ہوئی ہیں مری زنجیر کی کڑیاں
پڑتی ہے غضب وادیٔ وحشت میں کڑی دھوپ

ہیں سرو و صنوبر جو جلیں دھوپ میں دن بھر
وہ سرورِ رواں سہہ نہ سکے ایک گھڑی دھوپ

فرقت میں مجھ کو دوزخِ غربت قبول ہے
کیا کام اگر وطن میں ہے ہر رہ گذر بہشت

اے حور جاؤں میں ترے دروازے سے کہاں
دوزخ تمام شہر ہے، تیرا ہے گھر بہشت

میں وہ نہیں جو یادِ وطن میں ہلاک ہوں
پروا نہ ہو مجھے، جو نہ آئے نظر بہشت

اغیار کی جو سعی سے بالفرض جاؤں میں
واللہ، ہونگاہ میں مثلِ سقر، بہشت

مجھ کو نوائے بُلبُلِ شیراز یاد ہے
کیا لکھنؤ، کہ مُنہ نہ کروں، ہو اگر بہشت

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بپائ مردیِ ہمسایہ در بہشت

ناسخ کو جیتے جی جو گزرنا محال ہے
اے رشکِ حور! تیری گلی ہے مگر بہشت

ثانے ہے دن رات سرچنگِ حوادث آسماں
سر پھرا ہے سرکشو! رکھتے ہو کیوں دستار کج

ظاہر و باطن میں یاں یوں ہے کجی در راستی
راست ہے اندر سے گھر، باہر سے ہے دیوار کج

خیریت چاہے تو سیدھی چال چل او مالِ مست
گرتے ہیں، نشے میں چلتے ہیں اگر مے خوار کج

راستی کا نام بھی اِس شہر میں سنتے نہیں
کیوں نہ ہوں سب لکھنؤ کے کوچہ و بازار کج

تیرے پھندے سے نکلنا ہے محال اے قاتل!
زلف سے بھی ہیں سوا رشتۂ زُنّار کے پیچ

آئے گا پیچ میں، ہے خواہشِ رفعت جس کو
دیکھتے ہیں سخت اذیت، رہِ کہسار کے پیچ
کج ادا کج جو ملی وادیِ غربت ناسخؔ!
آ گئے یاد مجھے کوچۂ دلدار کے پیچ

رنگِ ہر گل اُڑ گیا ایسا مرے گل کے حضور
بن گیا صحنِ چمن، اے باغباں! تصویرِ صبح
وصل کی شب ہو گئی آخر، ہوا عالم سیاہ
آج کیا برعکس آتی ہے نظر تاثیرِ صبح

حنائی ہاتھ ذرا دیکھو اُس سہی قد کے
بھلا یہ سرو نے پائی کہاں بہار کی شاخ
یہ دستِ جود ہی رہتا ہے سب سے بالا دست
وگرنہ پست ہے ہر نخلِ باردار کی شاخ
ہوئے ہیں کیا ہی تہی دست ہائے اہلِ وطن
نہ اِس چمن میں رہی کوئی برگ و بار کی شاخ
شگفتہ رہتے ہیں گل ہائے معنیِ رنگیں
نہیں ہے خشک مرے کلکِ مشکبار کی شاخ

لے کے خط جا شتاب اے قاصد
جلد لے آ جواب اے قاصد
کیجیو قطع راہ راتوں کو
ہے شبِ ماہتاب اے قاصد

جلد گنگا اُتر کہ زیست مری — ہے بسانِ حباب اے قاصد
تیرے دل میں کرے کہیں تاثیر — یہ مرا اضطراب اے قاصد
رازِ پنہاں بھی آشکار کروں — نہیں تجھ سے حجاب اے قاصد
خانۂ دل بغیرِ جلوۂ یار — ہو رہا ہے خراب اے قاصد
وصلِ جاناں ہو یا اجل آئے — زندگی ہے عذاب اے قاصد
دیتے ہیں ساکنِ الٰہ آباد — مجھ کو وحشی خطاب اے قاصد
کیا کسی شغل میں بھلا بہلے — دلِ پُر اضطراب اے قاصد
وہم میں بھی کبھی نہ تھے یہ دن — ہے جُدائی کہ خواب اے قاصد

خطِ ناسخ کا لاجواب شتاب
ہو دُعا مستجاب اے قاصد

مُنہ مرا غم سے یہ ہے اے بُتِ بے پیر سفید
کھینچیں تصویر، تو ہو کاغذِ تصویر سفید

کیا ترے رنگِ طلائی پہ چمکتا ہے عبیر
اس طرح سے نہ ہو خاکسترِ اکسیر سفید

سُرخ ہے چہرۂ ساقی قدحِ مے کی طرح
عارضِ ماہ ہے مثلِ قدحِ شیر سفید

رات دن پیرِ فلک کی ہے دورنگی ظاہر
زرد ہے پرتوِ خور، ماہ کی تنویر سفید

موت کو یاد کرے، تارِ کفن آئیں نظر
اس لیے ہوتے ہیں موے بدنِ پیر سفید

سُرخ دیکھا جو خوشی سے مرے چہرے کو کبھی
ہو گیا غم سے رُخِ دشمنِ بے پیر سفید
شوخ ہے رنگ سنہرا یہ ترے سینے کا
صاف آتی ہے نظر سونے کی زنجیر سفید

خوں سفید ایسا ہے ابنائے زماں کا ناسخ
کیجیے قتل جو اِن کو، تو ہو شمشیر سفید

چاندنی گردِ قدم، چاند ہر اک نقشِ قدم
رات کیسی ہو سیہ، کر دے تری چال سفید

نہیں ممکن کہ سیہ دل نہ ہو زر داروں کا
ایک دن میں ہو سیہ، کیسی ہو ٹکسال سفید

حُسن کو چاہیے انداز و ادا ناز و نمک
لطف کیا گر ہوئی گوروں کی طرح کھال سفید

واہ کیا رنگ ہے، گویا کہ ٹپکتا ہے شہاب
مُنہ وہ پونچھے، تو ابھی سُرخ ہو رومال سفید

ہے مثلِ یاسمیں بدنِ نازنیں سفید
ان خوبیوں سے بلکہ نہیں یاسمیں سفید

دامن کی طرح رہتی ہے روز اشکِ خوں سے لال
دیکھی ہے کب کسی نے مری آستیں سفید

دیکھے ہمارے دفترِ اشعار کو اگر
قرطاس کی طرح ہو رخِ نکتہ چیں سفید

کرے پسند ان میں سے ناسخ تو کوئی رنگ
مستی ہے سرخ، کفر سیہ، اور دیں سفید

اے رشکِ شمع و ماہ ترا نور دیکھ کر
انجم کی ہو رہی ہے تمام انجمن سفید

اے گُل! ترے حضور نہ ٹھہرے کوئی بھی رنگ
ہو جائے ایک دم میں چمن کا چمن سفید

گُل عذاروں کی جو محفل میں گیا وہ گُلِ تر
ہو گئے زرد جو دو چار تو دو چار سفید

روشن اے ماہ کیا تو نے سیہ خانہ مرا
تیرے جلوے سے ہوئے ہیں در و دیوار سفید

بعد اک عُمر کے ناسخ کی جواب آمد ہے
لکھنؤ کے ہوئے سب کوچہ و بازار سفید

مل گئے ہیرے کے بازوبند صاف اے رشکِ ماہ
سیمِ خالص سے زیادہ ہیں ترے بازو سفید

کہتے ہیں سب، چادرِ مہتاب میں لپٹا ہے چاند
اے پری پیکر، پہنتا ہے جو کپڑے تو سفید

ہجر میں یوں چاندنی راتیں سیہ ہیں جس طرح
ماہِ عارض سے نہیں ہوتی شبِ گیسو سفید

باغ میں جاتا ہے جب بندِ قبا کھولے وہ گُل
غش سے ہو جاتی ہے چشمِ نرگسِ بیمار بند

یوسفستاں ہو گئے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ
ایک مدت سے پڑا ہے مصر کا بازار بند

نیند آئے گی کہ موت آئے گی ہجرِ یار میں
دیکھیے کیوں کر ہوں اپنے دیدۂ بیدار بند

کفر ایسا اے صنم پھیلا ہے تیرے عہد میں
ہے رگوں سے باغ میں ہر ایک گل، زنار بند

محتسب بے رحم نے ایسی لنڈھائی ہے شراب
ہو گئی ہے آج راہِ خانۂ خمار بند

تیرے ابرو سے کسی صورت نہیں ممکن نباہ
سحر سے ہو جاتی ہے تلوار کی بھی دھار بند

کھل گئی جادو بیانی بزم میں ناسخ کی آج
کر دیا میں نے اسے تقریر میں سو بار بند

تیری آنکھیں تو سخن گو ہیں مگر کون سُنے
کیوں کر آواز کریں مردمِ بیمار بلند

کاکلِ وروئے صنم دیکھ کے ثابت یہ ہوا
روزِ روشن سے ہے رتبے میں شبِ تار بلند

ظاہر اگردشِ گردوں ہے ہنڈولے کی طرح
پست دو چار زمانے میں ہیں، دو چار بلند

دل لگایا ہے کہیں نام خدا تو نے بھی
ورنہ کیوں آتے ہیں او بُت تجھے اشعار پسند

کہتے ہیں، ہوتی ہے بات اُلٹی پری زادوں کی
اے پری! ہے ترے اقرار سے انکار پسند

غیر کے دل سے مرا دل ہے اگر خوب، تو کیا
ہے وہی جنس، کرے جس کو خریدار پسند

یہی گھر رنج سے خالی نظر آیا مجھ کو
اِس خرابات میں، ہے خانۂ خمّار پسند

چین آنے کا نہیں کوچۂ جاناں کے سوا
یہ چمن کیا، کہ نہ ہوں خلد کے گلزار پسند

بات کس سے کروں، چپکی مجھے لگ جائے نہ کیوں
وہ نہیں، ہائے، مجھے جس کی تھی گفتار پسند

ہم ہیں دیوانے، ہمیں چاہیے نا آہنی، زنجیر
نہ تو سبحہ ہے پسند اور نہ زُنّار پسند

منکر اُس بُت کے جو ہیں، اچھی خدا نے دی سزا
حاجیوں نے بوسہ لینے کو کیا پتھر پسند

زاہدا، کب تیرے کہنے سے کروں گا ترک مَیں
چھوڑ کر جنت، کیا ہے کوچۂ دلبر پسند

دیکھنا انصاف سے جوہر شناسی خلق کی
جائے تیغ، اب کرتے ہیں آئینے کا جوہر پسند

خلق جھکتی جاتی ہے، خالی نہیں ہوتا کبھی
ساقیا! ہے تیری چشمِ مست کا ساغر پسند

اپنے زندوں میں ہی ناسخ! شعرخوانی کیجیے
خشک ہے زاہد، اُسے کیا آئے شعرِ تر پسند

ہوئی یاں آمد و رفتِ نفس بند — قبا کے اس قدر ظالم نہ کس بند
غبارِ دشتِ مجنوں، کیا ہے سُرمہ؟ — کہ ہو جاتی ہے آوازِ جرس بند
میں فریادی نہیں، افسانہ خواں ہوں — کرے گا خواب چشمِ دادرس بند

قدر اپنی، تیری مدح سے ہے جانِ جاں! بلند
آواز جیسے ہوتی ہے وقتِ اذاں بلند

ادنا جو ہیں، نہ ہوں گے وہ اعلا کسی جگہ
ہر جا زمین پست ہے اور آسماں بلند

دیکھو تو مہر و مہ کے طلوع و غروب کو
رکھتا ہے کس کو چار پہر آسماں بلند

ملتا نہیں زمین پر اُن کا نشاں کہیں
تا آسمان دیکھے ہیں جن کے مکاں بلند

اُفتادہ ہوں جو پستیِ طالع سے، غم نہیں
برگِ خزاں کو کرتی ہے بادِ خزاں بلند

خود فراموشی دوچنداں ہوتی ہے ہر دم مجھے
وصل کا دن روزِ فرقت میں اگر آتا ہے یاد

خشک ہو جاتا ہے حاسد کا لہو، سننے کے ساتھ
کوئی ناسخ کا جو مجھ کو شعر ترا آتا ہے یاد

پیری میں ہوئے نالۂ گرم اپنے، دلا، سرد
معمول ہے، چلتی ہے دمِ صبح، ہوا سرد

حیران ہوں، کیوں ہاتھ ترے بن گئے شعلے
کہتے ہیں کہ تاثیر میں ہوتی ہے حنا، سرد

میرے مکتوب کو تم پھاڑ کے پھینکا نہ کرو
کہ اٹھا لیتے ہیں رستوں سے مسلماں کاغذ

صورتِ برگِ خزاں، دشتِ جنوں میں ناسخ
میرے دیوان کے رہتے ہیں پریشاں کاغذ

اس مرحلے میں خانہ بدوشی ضرور ہے
گھر اپنے واسطے کروں تعمیر دوش پر

اُس گُل کے پاس عین زمستاں میں ہے بہار
گلزار ہے دو شالۂ کشمیر دوش پر

راز اپنے کھل گئے خط کی طرح
مل گئے غیروں سے اکثر نامہ بر

آہِ شب کا تو اثر اُلٹا ہے اُس خورشید پر
مانگتا ہوں میں دُعا ے صُبح کس اُمید پر

آپ اب چلنا پڑا نا سیخ، دیارِ یار کو
قاصد اپنا آج تک آیا نہ اس تاکید پر

کیا شبِ فرقت میں صدمے ہیں دلِ بے تاب پر
مثلِ زخمی لوٹتا ہوں چادرِ مہتاب پر

دانتوں پر ہے بہار مسّی کی
رنگ لایا ہے پان، ہونٹھوں پر
گٹکری ہے گلے میں کافر کے
دیکھیے جب، ہے تان ہونٹھوں پر

ہے جُدا وہ ماہ ہم سے، داغِ سوزاں ہم کنار
ہالۂ خورشید کا عالم ہے اب آغوش پر

ہوگئی کُنجی ہمیں موجِ نسیمِ نوبہار
تھا بہ رنگِ غنچہ قفل اپنے لبِ خاموش پر

نقدِ جاں کیسۂ قالب سے جو نکلے، نکلے
دیکھ مُمسک! کہیں تھیلی سے نہ ہو زر باہر

بعد مرنے کے بھی ہے ساتھ یہاں فصلِ بہار
قبر میں داغِ جنوں، پھولوں کی چادر باہر

اے اجل! تو نے غضب تفرقہ پردازی کی
قبر میں تو سرِ شوریدہ ہے، پتھر باہر

ہوش میں آتا ہے انساں مرگِ انساں دیکھ کر
یاد آتا ہے وطن، گورِ غریباں دیکھ کر

ایسی ہستی سے تو سو درجہ عدم ہی خوب تھا
یاد آیا مجھ کو صحرا، کُنجِ زنداں دیکھ کر

موت سے ڈرتا نہیں، لیکن یہ آتا ہے خیال
کیا بھلا جنّت کو دیکھوں، کوے جاناں دیکھ کر

بچھ رہے ہیں برگِ گُل، کوئی رگِ گُل چُبھ نہ جائے
پانو رکھ گلشن میں اے سروِ خراماں دیکھ کر

ڈیوڑھیوں پر بہرِ حفظِ جاں عبث ہے بند و بست
موت پھر جاتی ہے کوئی چوبِ درباں دیکھ کر

تو ہی وہ گُل ہے کہ ہے تجھ پر فدا جانِ بہار
اس چمن میں ورنہ ہر گُل پر ہے احسانِ بہار
نظمِ ناسخ ہے جو مضموں ہاے رنگیں سے چمن
ہوگئے برگِ خزاں، اوراقِ دیوانِ بہار

کرتی ہے مجھے قتل مرے یار کی رفتار
تلوار کی تلوار ہے رفتار کی رفتار

کج ایسی نہ تھی آگے مرے یار کی رفتار
سیکھا ہے مگر چرخِ ستم گار کی رفتار

لغزش نہ ہو کیوں کر رہِ دیں میں مجھے زاہد!
یاد آگئی اُس کافرِ مے خوار کی رفتار

موتی، عوضِ نقشِ قدم، گرتے ہیں ناسخ
ایسی ہے مرے کلکِ گہر بار کی رفتار

کیا کسوٹی کی طرح سے ہو گئے ہیں دل سیاہ
کس قدر ہم غافلوں کو ہو گیا سودائے زر

زر کے پیچھے طالبِ زر ہو رہے ہیں کیا ہلاک
فائدہ کیا، نقدِ جاں دے کر جو کوئی پائے زر

خاموش جو بیٹھے ہیں یہ بت، ہیں بڑے خوں خوار
سُنتا ہے کوئی کب لبِ سوفار کی آواز

از خود نہیں بول اُٹھتے، جو ہیں صاحبِ تمکیں
بولے جو کوئی، تب سُنئے کہسار کی آواز

اے غافلو! کُھل جائیں اگر گوشِ حقیقت
آئے دہنِ غیر سے بھی یار کی آواز

مُردوں کو جِلاتی ہے ترے ناز کی آواز
اعجاز کا اعجاز ہے، آواز کی آواز

کیا ہجر میں خوش آئے مجھے ساز کی آواز
یاد آتی ہے ہر دم کسی دم ساز کی آواز

چلاتے پھریں کیوں نہ، کہ یاد آ گئی ہم کو
وہ ناز کی رفتار، وہ انداز کی آواز

ہے گلشنِ قرطاس میں گُل بانگِ عنادل
میرے قلمِ قافیہ پرداز کی آواز
ناسخ کی غزل سُن کے کہا کرتے ہیں شاباش
آتی ہے مجھے حافظِ شیراز کی آواز

اُس پری رُو کا محرّم میں نہیں ملبوس سبز
ہے بدن تو شمعِ کافوری، قبا فانوس سبز
ہو گئی سُرخی صنم، تیرے قدم کے فیض سے
ورنہ تھی رنگت حنا کی تا دمِ پابوس، سبز
گو چلے بادِ بہاری، یا کہ آئے برشکال
یاں نہ ہوگا نخلِ امیدِ دلِ مایوس سبز

فصلِ گل میں گھر مرا ہوتا ہے ویراں ہر برس
اے جنوں، آباد کرتا ہوں میں زنداں ہر برس
گل نہیں، کھلتا ہے ناسخ کا یہ دیواں ہر برس
بُلبُلیں ہوتی ہیں گُلشن میں غزل خواں ہر برس
کیا گرہ دینے میں نادانی سے کرتے ہیں خوشی
فی الحقیقت ہوتی ہے کم عمرِ انساں ہر برس
چھپتے جاتے ہیں ستارے جس طرح سے صُبح دم
کم ہوئے جاتے ہیں یاں پیری میں دنداں ہر برس
کب ہے لالہ مجھ بیاباں مرگ کی تربت کے گرد
کرتی ہے فصلِ بہاری یہ چراغاں ہر برس

ہے محرم، نخلِ ماتم کے لیے فصلِ بہار
تازہ ہوتا ہے غمِ شاہِ شہیداں ہر برس

اس قدر جوشِ جنوں ہوتا ہے اے ناسخ مجھے
آپ اپنے سے میں ہوتا ہوں گُریزاں ہر برس

کیوں مشقت سے بناتا آئنہ فولاد کا
واقعی ہوتا دلِ روشن جو اسکندر کے پاس

تفرقہ جب تک نہیں، اضداد باہم ایک ہیں
شیشہ بھی مثلِ شرر پنہاں ہے ہر پتھر کے پاس

ہوش کب جلوۂ دیدار میں رہتے ہیں بجا
ہو گئے حضرتِ موسیٰؑ سے پیمبر بے ہوش

فاقہ مستی سے ہمیں بھی ہے بھلا ہوش کہاں
ہیں اگر نشۂ دولت سے تونگر بے ہوش

اے فلک! نشۂ جو قسمت میں نہیں، غش ہی سہی
مُغتنم جانوں میں ہو جاؤں جو دم بھر بے ہوش

خضر کی طرح کروں کیا طلبِ آبِ بقا
بادۂ موت سے ہوں مثلِ سکندر بے ہوش

کس کے وہ باندھتے ہیں اپنی کمر کو کیوں کر
مجھ کو دشوار ہے مضمونِ کمر کی بندش

تو ہے گُل دستۂ گُل زارِ نزاکت اے گُل
چاہیے تیرے لیے تارِ نظر کی بندش

شبِ فرقت میں چِچا لیجیو غُل میری طرح
اے مُؤذّن، ہے شبِ وصل، خدارا خاموش

توڑوں جو اپنے پائے طلب، فائدہ نہیں
تدبیر وہ کروں کہ شکستہ ہو پائے حرص

ہے کشتیِ نجات قناعت ہی غافلو!
ڈوبیں گے بحرِ غم میں، جو ہیں آشنائے حرص

معشوق و مے فروش و مُغنّی و گُل فروش
دُنیا میں ہے مجھے انھی دو چار سے غرض

جس طرح سے ہو گریبانِ سحر میں خورشید
رقص میں یوں نظر آیا تہِ داماں عارض

وہ بھبھوکا شبِ تاریک میں جاتا ہے اگر
آئنہ خانے میں کرتے ہیں چراغاں عارض

رات کو چہرۂ مہتاب نظر آتا ہے
کس طرح گیسوِ شب گوں میں ہوں پنہاں عارض

پیے جاؤں نہ مے کیوں ساقیا قرض
کریں گے ساقیِ کوثر ادا قرض

جو میں افلاس میں نکلا سفر کو
ہرا ے راہ زن کچھ لے لیا قرض

دِلا ہے بھیک بیگانوں سے بہتر
نہ مانگے آشنا سے آشنا قرض

بد عمل جو ہیں وہ باز آتے نہیں تعزیر سے
چور کو پروا نہیں، گو ہے مثالِ دار شمع

طائرِ مضموں گرے پڑتے ہیں پروانوں کی طرح
کُنجِ تنہائی میں ہے یاں کلکِ آتش بار شمع

بزمِ عالم میں ہے خاموشی سے اے ناسخ فروغ
گو سراپا ہے زباں، کرتی نہیں گفتار شمع

چل جنوں وادیِ وحشت کی طرف
بلکہ صحرائے قیامت کی طرف

گرم بازاری ہے کثرت سے تنگ
بھاگیے کوچۂ وحدت کی طرف

رنج دیتی ہے محبت سے بھی خلق
دل جو مائل ہے عداوت کی طرف

بادِ نوروزی نے پھونکی داغ ہائے تن میں آگ
ہاں بہ رنگِ غنچۂ لالہ ہے پیراہن میں آگ

آسماں پہنچا نہیں سکتا حسینوں کو ضرر
کب لگا سکتی ہے بجلی، ماہ کے خرمن میں آگ

میری آنکھوں سے اگر لختِ دلِ سوزاں گرے
بولے ہم دم، دیکھیے، ہے آپ کے دامن میں آگ

جب جلی ہولی، تو ناسخ ہم نے مانگی یہ دعا
یا الٰہی، یوں ہی بھڑکے سینۂ دشمن میں آگ

منہ لال ہے جو نشۂ دولت سے خوش نہ ہو
کچھ اور ہی دکھائے گا تجھ کو خمار رنگ

یاد آگئیں شباب کی رنگیں مزاجیاں
جب شام کو شفق کا ہوا آشکار رنگ

ناسخ! ہے میر سلمہ اللہ کی زمیں
اک معنیِ شگفتہ کو باندھا ہزار رنگ

داغِ حسرت دل میں ہیں، لختِ جگر آنکھوں میں ہیں
گلشنِ ہستی میں اے ناسخ، یہ ہم نے پائے گل

ہم نے زبانِ موجِ ہوا سے سنی یہ بات
مانندِ داغِ لالہ، زرِ گل ہے داغِ گل

بلبل شراب عیش سے کیا بے نصیب ہے
ٹوٹا ہوا ہے روزِ ازل سے ایاغِ گل

ناسخ! شراب پی، شبِ تاریک ہے تو ہو
روشن ہیں صحنِ باغ میں ہر سو چراغِ گل

واعظا! مسجد سے اب جاتے ہیں مے خانے کو ہم
پھینک کر ظرفِ وضو، لیتے ہیں پیمانے کو ہم

عقل کھو دی تھی جو اے ناسخ جنونِ عشق نے
آشنا سمجھا کیے اک عُمر بے گانے کو ہم

ہیں مضامینِ عذارِ آتشینِ یار گرم
ہو زمیں کیسی ہی ٹھنڈی، میں کہوں اشعار گرم

تھی خریداری متاعِ حُسنِ یوسف کی کسے
آتشِ شوقِ زلیخا سے ہوا بازار گرم

دولتِ تقدیر کو تدبیر کی حاجت نہیں
معدنِ زر ہے جہاں، اکسیر کی حاجت نہیں

ہرزہ گوئی سے کہیں بہتر ہے خاموشی دلا!
عاشقوں کو آہِ بے تاثیر کی حاجت نہیں

میں ہی اے ناسخ نہیں کچھ طالبِ دیوانِ میرؔ
کون ہے جس کو کلامِ میرؔ کی حاجت نہیں

اُس نے لکھا ہے اپنے ہاتھ سے خط! قاصدا، مجھ کو اعتبار نہیں
ہوئے بے نور دیدۂ ناسخ ہائے وہ گردِ رہگذار نہیں

وہی حسرت، وہی فغاں، وہی داغ کشورِ دل میں انقلاب نہیں

جو ترے عشق میں ہلاک نہیں زندگانی میں لطف خاک نہیں

دل پہ ظاہر ہے حالِ ہر دل کا — اس نگر میں کدھر کی ڈاک نہیں
آ گئے اُس گُل کے دعویِ خوشبو! — باغباں! گُل کے مُنہ پہ ناک نہیں

ہجر ہی کوئی دن ہے وصل کی طرح — کہ کسی شے کو یاں ثبات نہیں
ترکِ دُنیا میں سوچ کیا ناسخ — کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

ہاتھ اُس کے چوم لیتا ہوں، تو کیا کہتا ہے وہ
ہیں لکیریں یا کوئی لکھی ہے آیت ہاتھ میں

ارمغاں لے جاؤں ناسخ! سوئے گُل زارِ وطن
چُن لیے ہیں خارہائے دشتِ غُربت ہاتھ میں

جان جب تک ہے، یہ لپکا ہے نظر بازی کا
کہ رگِ جاں ہے، جسے تارِ نظر کہتے ہیں

دستِ وحشت نے کیا چاک گریباں میرا
کیا اِسی کو شبِ فرقت کی سحر کہتے ہیں؟

دھوم عالم میں مچی ہے تری بدنامی کی
ہائے ناسخ، تجھے کچھ عار نہیں، ننگ نہیں

مینائے مے سے کم نہیں ہم مے کشوں کا حال
لب ریز اگر شراب نہیں، آبرو نہیں

کیا ہاتھ اُٹھاؤں بہرِ دُعا سوے آسماں
بر آئے جو کبھی، وہ ٹھہری آرزو نہیں

مانندِ عکس آپ بھی کھو یا گیا ہوں میں
پیشِ نگا جب سے وہ آئینہ رو نہیں

عالم ہے محو آئنہ خانے کی سیر میں
اپنے سوا، کسی کے کوئی رو بہ رو نہیں

ہوں راندۂ حرم، تو ٹھکانا ہے دَیر میں
یادِ صنم ہے دل میں، اگر یادِ حق نہیں

اے مُنعمو، سُن مرے نالے ذرا پردیس میں
درد ہے ایسا بھلا کاہے کو تیرے دیس میں

خوار جو ظاہر میں ہیں، اُن کو حقارت سے نہ دیکھ
کیمیا گر پھرتے ہیں اکثر گدا کے بھیس میں

صحبتِ رندانِ ساغر کش مجھے آتی ہے یاد
پھنس گیا ہوں حلقۂ زہّادِ کاسہ لیس میں

جو قطرۂ عرق ہے، وہ گوہر سے کم نہیں
اپنا بدن ہی آپ کو زیور سے کم نہیں

ہوتا ہے رنجِ دولتِ دنیا سے اِس قدر
دینار میرے ہاتھ کو اخگر سے کم نہیں

ہر بُت زبانِ حال سے کہتا ہے اے صنم
گویا نہ لعلِ لب ہوں، تو پتھر سے کم نہیں

مرضِ عشق سے دی مجھ کو شفا شانی نے
اب تری نرگسِ بیمار سے کچھ کام نہیں

گھر میں اب چین سے بیٹھوں، کہ وہ سودا نہ رہا
گردشِ کوچہ و بازار سے کچھ کام نہیں

شبِ تاریکِ لحد کا ہے تصور مجھ کو
ہجرِ جاناں کی شبِ تار سے کچھ کام نہیں

ساغرِ عمر لبالب نظر آتا ہے مجھے
ساقی و خانۂ خمار سے کچھ کام نہیں

چمنِ خلد میں اب چل کے کروں گُل چینی
بوسہ ہائے گُلِ رُخسار سے کچھ کام نہیں

کیجیے سایۂ طوبا میں بہ خوبی آرام
یار کے سایۂ دیوار سے کچھ کام نہیں

روح جاتی ہے کھنچی عالمِ بالا کی طرف
قدِ بالائے جفا کار سے کچھ کام نہیں

روِشِ عمرِ رواں کا مجھے آیا ہے خیال
یار کے جلوۂ رفتار سے کچھ کام نہیں

کیوں کر ترے آگے نہ جھکے حُور کی گردن
بجلی کی کمر، شعلے کا مُنہ، نور کی گردن

یہ گیسوِ مشکیں وہ بھلا لائے کہاں سے
پائی ہے اگر شمع نے کافور کی گردن

مثلِ رگِ گردن ہوئی زنجیرِ طلائی
ایسی ہے سنہری بُتِ مغرور کی گردن

قلقل نہیں، حق حق کی یہ آواز ہے ساقی!
شیشے کو کہاں مل گئی منصور کی گردن

سب خلق کا خوں تیری ہی گردن پہ ہے ساقی
یہ بوجھ اُٹھاتی نہیں مزدور کی گردن

غم نہیں اے فلک جو تاج نہیں — ہم کو سر کی بھی احتیاج نہیں
بلبلو! گُل ہنسیں، تو کیوں نہ رکوں — کہ ہنسی کا مرا مزاج نہیں

احباب سے مانگوں میں اگر نزع میں پانی
ٹپکائیں نہ آبِ دمِ شمشیر گلے میں

اُس زلف کے اوصاف زباں تک [illegible] آتے
ہر بار اُلجھ جاتی ہے تقریر [illegible] میں

ہے ملکِ نصارا میں تمنا یہی ناسخ
پھانسی ہو وہی زلفِ گرہ گیر گلے میں

چاندنی، سایے کے مانند ہے فرقت میں سیاہ
شمع کیا، آج تو مہتاب میں بھی نور نہیں

وہ نہیں بھولتا، جہاں جاؤں — ہائے میں کیا کروں، کہاں جاؤں
یہ نہیں چاند، ہے وہی محبوب — کس طرح تا بہ آسماں جاؤں
خاک اُڑاتا ہوا ہر اک بن میں — صورتِ گردِ کارواں جاؤں
جی میں حسرت ہے قاصدوں کی طرح — ڈھونڈھتا یار کا مکاں جاؤں

ہائے جو کرتے ہیں، سب اہلِ زمیں کرتے ہیں
اے فلک، تجھ سے مجھے شکوۂ بیداد نہیں

وحشیو! کہتی ہے زنجیر بہ آوازِ بلند
بستۂ عقل جو ہے، غم سے وہ آزاد نہیں

مر کے بھی چھٹتے نہیں آپ کی زلفوں کے اسیر
یہ عجب قید ہے، جس کی کوئی میعاد نہیں

مست ناسخ مجھے رکھتا ہے کلامِ حافظ
میرے ساغر میں بہ جُز بادۂ شیراز نہیں

بین کی آواز دل کش اس قدر ہوتی نہیں — کر رہی ہیں سحر اُس مطرب پسر کی اُنگلیاں

سوائے اہلِ سخن، ہو مشاہدہ کس کو
نہاں ہے شاہدِ معنی، سخن کے پردے میں

تلاش جس کی ہے دن رات تجھ کو اے غافل
چھپا ہوا ہے وہ تیرے ہی تن کے پردے میں

طریقِ عشق چھڑایا ہے تو نے غارت گر!
ملا ہے خضر مجھے راہ زن کے پردے میں
خبر نہ شامِ غریبی کی مجھ کو تھی ناسخ!
چھپی ہوئی تھی یہ صبحِ وطن کے پردے میں

مجھ کو اب ساقیِ گل فام سے کچھ کام نہیں
مے سے کچھ کام نہیں، جام سے کچھ کام نہیں
خانہ برباد ہوں صحرا میں بگولوں کی طرح
سقف و دیوار و در و بام سے کچھ کام نہیں
طائرِ روحِ رمیدہ کی طرح چھوٹا ہوں
اب تو صیاد! ترے دام سے کچھ کام نہیں
اتنی مدت سے ہوں غربت میں، وطن بھول گیا
مجھ کو اب نامہ و پیغام سے کچھ کام نہیں
طبعِ روشن کو نہیں خوف سیہ روزی کا
صبحِ محشر ہوں، مجھے شام سے کچھ کام نہیں

گو یہ غم ہے کہ وہ حبیب نہیں — پر خوشی ہے، کوئی رقیب نہیں
زندگانی مرض ہے، موت شفا — بجز اجل اب کوئی طبیب نہیں

آنکھ کی بند، بت ہوا موجود — کوئی مجھ سا بھی بت تراش نہیں
چٹکے کھاتے ہو ٹھوکریں پسِ مرگ! — آج وہ شورِ دور باش نہیں

چل دلا، دیکھیں اور نگری کو		اب یہاں طورِ بود و باش نہیں

تم چلے دو قدم، ہوا برپا		حشر کو انتظارِ صور نہیں

کر دیا مجلس کی مجلس کو تری باتوں نے قتل
کوئی جز شمشیر تیرا ہم زباں ملتا نہیں

فصلِ گُل میں سیرِ گلشن کو نہ جایا چاہیے
اِن دنوں ناسخ! دماغِ باغباں ملتا نہیں

کوے جاناں کی تمنّا تھی ہمیں
ہاے، جنّت میں قدم دھرتے ہیں

لوگ دنیا سے جو دن رات سفر کرتے ہیں
کوچ کی بے خبروں کو یہ خبر کرتے ہیں

مے گل گوں سے ہوا سُرخ مرا روے سفید
کیمیا گر یوں ہی چاندی کو بھی زر کرتے ہیں

کام جلوت سے نہیں رکھتے ہیں خلوت کے سوا
کس کی محفل کہ ترے دل میں گزر کرتے ہیں

سودا ے عشقِ غیر کہاں ہے، بہ رنگِ گُل
اپنے ہی حُسن پر میں گریباں دریدہ ہوں

گو جان جائے، غم نہیں، لیکن نہ بات جائے
ناسخ! وہ کھینچ رہا ہے، تو میں بھی کشیدہ ہوں

ملا عکسِ شفق کو رتبۂ اکسیر پانی میں
طلائی ہو گئی ہر موج کی زنجیر پانی میں
جو پانی ہے، وہی میں ہوں، یہ فرقِ اعتباری ہے
زبانِ موج کرتی ہے یہی تقریر پانی میں

یاد آتی ہیں ہمیں جان! تمہاری باتیں
ہائے وہ پیار کی آواز، وہ پیاری باتیں

پہروں چُپ رہتے ہیں ہم، اور اگر بولتے ہیں
وہی پھر پھر کے اُلٹتے ہیں تمہاری باتیں

کیجیے سحر بیانی سے مسخر کیوں کر
کبھی سُنتا نہیں ناسخ وہ ہماری باتیں

سب کی سب کیا ہیں شبِ قدر، ہماری راتیں!
کٹتی ہیں آنکھوں ہی میں ہجر کی ساری راتیں

یوں خیالِ روئے جاناں ہے دلِ بے تاب میں
جس طرح سے عکس ہو مہتاب کا گرداب میں

ہو سکی مجھ سے نہ بیداری میں اپنے دل کی سیر
سیکڑوں منزل پہنچ جاتے ہیں انساں خواب میں

سالکوں کو کوئی آفت سدِ رہ ہوتی نہیں
مچھلیاں پھنستی نہ دیکھیں حلقۂ گرداب میں

پڑ گیا ہے چشمِ ساقی کا کہیں دریا میں عکس
ورنہ یہ گردش کہاں سے آگئی گرداب میں

تُندرفتاری سے ہوگا جلد دولت کا زوال
دیکھئے دریا میں کہاں، جو توڑ ہے سیلاب میں

چلوں وطن کو دلا جامہ پارسا بن کر
ذرا شراب کے دھولوں میں داغ گنگا میں

یہ نوچے کھاتے ہیں زندوں کو کان پور کے لوگ
کہ جیسے کھاتے ہیں مُردوں کو زاغ گنگا میں

حواسِ گُم شُدہ کو ڈھونڈھتے تھے غربت میں
ملا ہے اب ہمیں بارے سُراغ گنگا میں

اُدھر بہاتے ہیں گُل اور اِدھر نہاتے ہیں گُل
ہر ایک صُبح شگفتہ ہے باغ گنگا میں

ہے صاف آئنہ، یہ تمھارا بدن نہیں
گویا غلافِ آئنہ ہے، پیرہن نہیں

فصلِ گُل میں ہے جنوں! زنداں کو میرا انتظار
حلقۂ زنجیر، جائے دیدۂ بیدار ہیں

اب نہ وہ چاکِ گریباں ہے، نہ وہ دامانِ دشت
ناتوانی سے ہمارے دست و پا بے کار ہیں

بے گدازِ دل، نہیں ممکن کہ ہو سیرِ سلوک
دیکھ او زاہد! روانی آبِ آہن میں نہیں

دونوں اُس غارت گرِ دیر و حرم کے یار ہیں
یہ سبب ہے ربط جو شیخ و برہمن میں نہیں

سبز کی ہے یاں شرابِ سُرخ نے کشتِ عمل
دانۂ تسبیحِ زاہد اپنے خرمن میں نہیں

ہوں اسیرِ ضعف، کر آزاد اے جوشِ جنوں
طوق کوئی جُز گریباں میری گردن میں نہیں

شہر کی جانب جو چلتا ہوں تو اُٹھتے ہی نہیں
لگ گئی جب سے جنوں! خاکِ بیاباں پانو میں

فیضِ ساقی ہے برابر کس و ناکس پہ مُدام
گردشِ جام ہے یہ گردشِ افلاک نہیں

کم نہیں غُنچے سے اُس گُل کی جُدائی میں ہم
دل ہے صد چاک، گریبان اگر چاک نہیں

خاکساری میں کسی کو ہے بھلا کیا نسبت
کوئی عُنصر مرے قالب میں بہ جُز خاک نہیں

ہنس کے کہتا ہے وہ ناسخ کے رُلانے کے لیے
دیدۂ تر نہ ہو دریا تو نگہ پاک نہیں

طعنہ زن زاہدِ بے دیں ہے عبث ناسخ پر
کون بندہ ہے خُدا کا جو گنہ گار نہیں

دشمن و دوست جو سُنتا ہے، وہ خوش ہوتا ہے
مثلِ بُلبُل مرے نالے بھی اثر رکھتے ہیں

رُتبۂ راندۂ درگاہ بھی دیکھ اے زاہد!
لوگ قرآن میں طاؤس کا پَر رکھتے ہیں

ساقیا! پاتے ہیں ہم تیغِ حوادث سے پناہ
جامِ مے پیتے نہیں، مُنہ پہ سپر رکھتے ہیں

اے خود آرا! گیا دُنیا سے خالی ہاتھ کیوں
لے گیا ہوتا یہ آئینہ سکندر ہاتھ میں

جس قدر رہے عمدگی، اُتنی نزاکت ہے ضرور
زور کب ہوتا ہے پانوؤں کے برابر ہاتھ میں

کرتے ہیں عالم کو جس کے پانو کے بچھوے شہید
اُس ستم گر کی بلا لیتی ہے خنجر ہاتھ میں

نرمی ہیرے کی کلائی، پہنچے ہیں یاقوت کے
اُس پری کو چاہیے کیا اور زیور ہاتھ میں

جب اُچکتی ہے طبیعت بہرِ مضمون بلند
طائرِ سدرہ کے آجاتے ہیں شہپر ہاتھ میں

ہاتھ دے دے مارتا ہوں جو زمیں پر دشت میں
چبھ رہے ہیں خار پانوؤں کے برابر ہاتھ میں

مے خانہ یہ خرابۂ عالم اگر نہیں
پھر کس لیے کسی کو کسی کی خبر نہیں

داغِ فراق ہے شبِ فرقت میں مشتعل
خورشید جلوہ گر ہے، ولیکن سحر نہیں

جو دل ہے، وہ محلِ حوادث ہے ہجر میں
محفوظ آفتوں سے خدا کا بھی گھر نہیں

کیا جانے کیسی ہوتی ہے ناسخ، عدو کی شکل
یاں کوئی جز حبیب، حضورِ نظر نہیں

چھوڑ دینے دستِ جاناں کیوں نہ اپنے ہاتھ سے
زندگی بھر ہائے ملنے تھے کفِ حسرت ہمیں

روگ اُلفت کا لگائے پھرتے ہیں ساتھ اپنے ہائے
لوگ مرتے جاتے ہیں، ہوتی نہیں عبرت ہمیں

خارِ صحرا بیٹھ کر دم بھر نکالیں پانو سے
ہو اگر سر پیٹنے سے اے جنوں فرصت ہمیں

پس از فنا بھی کسی طور سے قرار نہیں
مِلا بہشت، تو کہتا ہوں، کوے یار نہیں

نہیں حساب ہے جس طرح اُس کی رحمت کا
یوں ہی ہمارے گناہوں کا بھی شمار نہیں

ہماری جامہ دری میں ہے گُل کی کب تقلید
یہ وہ جنوں ہے کہ وابستۂ بہار نہیں

تمام رنج ہیں تا حشر ساتھ اے ناسخ
بہ جُز حیات کوئی چیز مُستعار نہیں

عُمر گزری کہ شب و روزِ جُدائی ہے وہی
میری قسمت میں مگر گردشِ ایام نہیں

جھنکار کیوں نہ نیند اُڑایا کرے کہ ہے
زنجیر بہرِ دیدۂ بیدار، پانو میں

رنگِ حنا نہیں، کہ صفاے بدن سے یہ
چھوٹا ہے رنگِ عارضِ دل دار، پانو میں

دشتِ جنوں میں آبلے پھوٹے نہیں مرے
یہ ہے شبیہِ دیدۂ خوں بار پانو میں

اٹھکھیلیوں سے چلتے ہو تم، مجھ کو ڈر ہے یہ
اُلجھیں کہیں نہ گیسوِ خم دار پانو میں

پھر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پانو میں

سب جان لیں کہ کوچۂ گیسو میں ہوں اسیر
زنجیر چاہیے سرِ بازار پانو میں

وہ دن گئے کہ ہاتھ میں رکھتے تھے پھول ہم
ناسخ! چبھے اب اُس کے عوض خار پانو میں

زمیں خاک فشاں، آسمان آب فشاں
یہی تو فرق ہے ادنا میں اور اعلا میں

جو تجھ کو دیکھے وہ بینا، نہ تجھ کو دیکھے سو کور
یہاں تو کچھ نہیں تمیز کور و بینا میں

جو علمِ غیب نہیں ہے سوائے عالمِ غیب
ہلاک جان نہ کر آج، فکرِ فردا میں

یہ غم ہے، نہ کردے جُدا کوئی گُل چیں
وہ گُل باغِ عالم میں ہے، خار میں ہوں

دگرگوں ہے ہر آن وضعِ محبت
کبھی غیر میں ہوں، کبھی یار میں ہوں

کہا حضرتِ دردؔ نے خوب ناسخ
یہ زُلفِ بُتاں کا گرفتار میں ہوں

دل جو ٹوٹا، آہِ آتش ناک پیدا ہو گئی
چوٹ کی سوزش ہے، ورنہ آگ پتھر میں نہیں

طفل یہ رُو رُو کے کہتے ہیں زبانِ حال سے
جو عدم میں چین تھا، دامانِ مادر میں نہیں

نورِ عرفاں جو نہ ہو جہل کی ظلمت میں نہاں
ایک ہی تجھ کو نظر آئیں یہ منظہر لاکھوں
ہوں وہ کافر کہ زمانے کے صنم ہیں مرغوب
ہوں وہ مجنوں کہ مجھے چاہییے پتھر لاکھوں
خاک ہو جاتے ہیں جیسے سمن و گُل ہر سال
ہو گئے خاک گُل اندام و سمن بر لاکھوں
آدمی کیا کہ سنو مجھ سے فرشتوں کا حال
جل گئے شعلۂ ادراک سے شہ پر لاکھوں

بھولے اللہ کو، تقصیر اسے کہتے ہیں
بُت پر اب مرتے ہیں، تعزیر اسے کہتے ہیں
ڈھیر جو ہے مری ٹوٹی ہوئی زنجیروں کا
خرمنِ دانۂ زنجیر اسے کہتے ہیں
مل گیا سونے کے گہنے سے سنہرا جوڑا
رنگ کہتے نہیں، اکسیر اسے کہتے ہیں
دم بہ دم کیا ہی مری عُمر کٹی جاتی ہے
دم نہیں کہتے ہیں، شمشیر اسے کہتے ہیں

باعثِ بُغض و عداوت زندگانی ہے فقط
ایک سے ہو جائیں گے شیخ و برہمن خاک میں

قصۂ شکر و شکایت بس یہیں تک ہے دلا
ایک دن مل جائیں گے سب دوست دشمن خاک میں

خاک اُڑتی ہے اگر گھر میں تو کچھ پروا نہیں
ایک دن مل جائے گا یہ خانۂ تن خاک میں

کرتے ہیں آئینہ ساز، آئینہ روشن خاک سے
مل گئے ہیں جو ہزاروں روے روشن خاک میں

ایک ہیں دریا کی لہریں، دُور کیا، نزدیک کیا
جو یہاں نا آشنا ہے، آشنا سے کم نہیں

ساتھ تیرا چھوڑ دے گا، راہ میں رہ جائے گا
اے مسافر! جسم تیرا نقشِ پا سے کم نہیں

گرچہ غربت ہے، تصوّر میں مگر ہمدم ہیں پاس
میری تنہائی بھی مجھ کو انجمن سے کم نہیں

لے چلا ہوں میں عدم کو بارِ غم، بارِ گناہ
رُوح بھی میری گرانی میں بدن سے کم نہیں

جو ہوا دنیا میں پیدا، فی الحقیقت مر گیا
آدمی کو جامۂ ہستی، کفن سے کم نہیں

اس چمن میں ہے بہ رنگِ گُل بقاے آفتاب
بے ثباتی میں ستارے، یاسمن سے کم نہیں

جنبشِ مژگاں نہیں، گویا ہے جنبش میں زباں
ہر اشارہ تیری آنکھوں کا، سخن سے کم نہیں

نام ور ہوتے ہی، ہو جاتے ہیں اکثر بے نشاں
مُہر کن کہتے ہیں جن کو، گورکن سے کم نہیں

جی لڑا دیتا ہے، کیسی ہو زمینِ سنگلاخ
خامہ، تیشہ ہے تو ناسخ، کوہ کن سے کم نہیں

وسعت آبادِ جہاں ہے یہ شبِ ہجر میں تنگ
کہ ستارے نہیں، گویا ہیں شرر پتھر میں

غیر کے آگے نہ ہو، مان مرے کہنے کو
اے صنم! کرتی ہے تاثیر نظر پتھر میں

کوہ کن! محو ہوا نقشِ وجودِ شیریں
فائدہ کیا، رہی تصویر اگر پتھر میں

ہو رہے ہیں پردہ ہاے چشم ہی گویا حجاب
دیکھنے کو آنکھیں ہیں، لیکن کوئی بینا نہیں

پوشیدہ جو دوست ہے نظر سے — ہے پیشِ نگاہ روے دشمن
بدنام ہے آسمان ناحق — ہے روزِ سیاہ روے دشمن

جو ہم فنا ہوں، تو لازم ہے اے نظر بازو!
ہمیں بھی یاد کرو، جب کوئی حسیں دیکھو

جو کانپور سے ناسخ، چلو بنارس کو
مزارِ پاکِ جنابِ علی حزیں دیکھو

یاد میں سب گُل عذارِ لکھنؤ
ہے تصور میں بہارِ لکھنؤ

یاد آجاتی ہے اے داغِ جنوں
کیا نسیمِ مُشک بارِ لکھنؤ

گُل سے رنگیں تر ہیں خارِ لکھنؤ
نشئے سے بہتر خُمارِ لکھنؤ

خود بہ خود بے خود ہوں، کیا یاد آگیا
کوئی رندِ بادہ خوارِ لکھنؤ

سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں
نقش ہیں نقش و نگارِ لکھنؤ

ہم صفیر! اپنا وطن ہے لکھنؤ
ہم تو بُلبُل ہیں، چمن ہے لکھنؤ

مُشک افشاں زلفِ محبوبوں کی ہیں
غیرتِ مُلکِ ختن ہے لکھنؤ

گلیوں میں ہر سنگ ریزہ ہے عقیق
راست کہتا ہوں، یمن ہے لکھنؤ

کوئی ایسا شہر دُنیا میں نہیں
غیرتِ دہرِ کُہن ہے لکھنؤ

میں نہیں ناسخ تو کیا تاریک ہے
شمع ہوں میں، انجمن ہے لکھنؤ

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھُڑائے لکھنؤ
لکھنؤ مجھ پر فدا ہے، میں فدائے لکھنؤ

تو نے دیکھے ہیں کہاں رنگیں ادائے لکھنؤ
لالہ و گُل کے چمن ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

پچھم اور اُتر کے کونے سے چلی آتی ہے روز
بوئے زُلفِ یار لے کر ہوائے لکھنؤ

دشتِ غربت میں نظر آتی ہے جب مہماں سرا
یاد آتی ہے مجھے عشرت سرائے لکھنؤ

بادشاہِ لکھنؤ کی ہو بیاں کس سے شکوہ
ہاتھ میں رکھتے ہیں جامِ جم گدائے لکھنؤ

تلخ اُس دم مجھ کو اپنی جانِ شیریں ہوگئی
یاد جب آیا کوئی شیریں ادائے لکھنؤ

کہتے ہیں چھوڑ گیا جامۂ ہستی ناسخ
دامن آنکھوں پہ رکھو، چاک گریبان کرو

آسماں کے نظر آتے نہیں تارے دن کو
تیری جوتی کے چمکتے ہیں ستارے دن کو

تم اگر چاند نہیں ہو تو بتاؤ مجھ کو
کیوں نہاں رہتے ہو پھر نظروں سے پیارے دن کو

یاد ہے، رات کو تم ہوتے تھے ہم سے نزدیک
دور سے کرتے تھے اے جان، اشارے دن کو

یہ دُعا آٹھ پہر وردِ زباں ہے ناسخ
رات کو وصل میسر ہو نظارے دن کو

مجھ کو عریانی میں ہو کیا پیرہن کی آرزو
اے جنوں! ہے ہجرِ جاناں میں کفن کی آرزو

ہچکیاں لے لے کے شیشے کی طرح دم توڑیں ہم
کیا یہی ہے ساقیِ پیماں شکن کی آرزو!

جلد نکلے جانِ شیریں، وصلِ جاناں گر نہیں
ہے وہی اپنی بھی، جو تھی کوہ کن کی آرزو

تو پڑھے غزلیں، سُنیں بیٹھے ہوئے خاموش سب
ہے یہی ناسخ، تمام اہلِ سخن کی آرزو

بے قراری دشتِ غربت میں ہمارے ساتھ ہے
چھوڑ آئے کوچۂ جاناں میں ہم آرام کو

میں خوب سمجھتا ہوں، مگر دل سے ہوں ناچار
اے ناصحو! بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھ کو

تم آؤ جہاں، دخل ہو کیا اور کسی کا
عالم کو بھلاتا ہوں، جو یاد آتے ہو مجھ کو

نہ لگ چلوں میں، یہی اپنے دل میں ٹھانی ہے
تری طرف سے ہزار اے پری، لگاوٹ ہو

وہ منہ چھپاتے ہیں جب تک حجاب سے شبِ وصل
عذارِ صبح سے شب کا نہ دور گھونگھٹ ہو

کرے وہ ذکرِ خدا اے صنم، بھلا کس وقت
جسے کہ آٹھ پہر تیرے نام کی رٹ ہو

شیشۂ مے طاقچوں سے، مے کشو! اُترے نہیں
مُغبچوں نے تخت پریوں کے اُتارے رات کو

تھا فلک حیرت میں، یہ ثابت ہیں یا سیّار ہیں
کل جو تیری کفش کے چمکے ستارے رات کو

دبی تھی آگ جو سینے میں، پھر بھڑک اُٹھی
کل اُس بھبھوکے نے دکھلائی جو بھڑک ہم کو

گلوں کی شاخ کو لچکاتی ہے نسیم عبث
کہ یاد ہے کمرِ یار کی لچک ہم کو

چوٹ دل کو جو لگے، آہِ رسا پیدا ہو
صدمہ شیشے کو جو پہنچے، تو صدا پیدا ہو

کشتۂ تیغِ جدائی ہوں، یقیں ہے مجھ کو
عضو سے عضو قیامت کو جدا پیدا ہو

ہم ہیں بیمارِ محبت، یہ دُعا مانگتے ہیں
مثلِ اکسیر نہ دُنیا میں دوا پیدا ہو

کہہ رہا ہے جرسِ قلب بہ آوازِ بلند
گم ہو رہ رو، تو ابھی راہِ خدا پیدا ہو

یاں کچھ اسباب کے ہم بندے ہی محتاج نہیں
نہ زباں ہو تو کہاں نامِ خدا پیدا ہو

گُل تجھے دیکھ کے گُلشن میں کہیں: عُمر دراز
شاخ کے بدلے وہیں دستِ دُعا پیدا ہو

ابھی خورشید جو چُھپ جائے تو ذرّات کہاں
تو ہی پنہاں ہو تو پھر کون بھلا پیدا ہو

بے سبب اسباب او غافل، فراہم کیا کروں
چھوڑ جاؤں گا میں سارے عالمِ اسباب کو

عشق کی تاثیر سے سوکھا نہ خونِ کوہ کن
بیستوں پر دیکھ ناسخ، لالۂ سیراب کو

خاک میں پوشیدہ ہو جائیں گے سب عالی دماغ
کرتی ہے گردِ زمیں دیکھو نہاں افلاک کو

تاب کیا، دیکھوں جو اُس کے روئے آتش ناک کو
کاہ کا رُتبہ وہاں ہے شعلۂ ادراک کو

چادرِ گُل کی یہاں حاجت نہیں اے رشکِ گُل
میری تُربت پر چڑھا اُتری ہوئی پوشاک کو

دل بنا عاشقی میں خود مختار   اور مجبور کر دیا ہم کو

جس قدر ہم سے تم ہوئے نزدیک — اُس قدر دور کر دیا ہم کو
اُلفتِ ظاہری سے او مغرور — تو نے مغرور کر دیا ہم کو
ہو گیا مے سے نشۂ عرفاں — نار نے، نور کر دیا ہم کو

جس طرح بعد سفیدی کے نہ ہوں بال سیاہ
ہو الٰہی نہ مرا نامۂ اعمال سیاہ
ایک میں اور یہ ہیں چار بلائیں کالی
خط سیہ، زلف سیہ، چشم سیہ، خال سیاہ
اپنے ہی روزِ سیہ سے نہیں واقف ناسخ
کیوں کیا کرتے ہیں کاغذ کو یہ رمّال سیاہ

واہ، ہیں کیا ہی ترے ابروِ خم دار سیاہ
ایسی ہرگز نہ ولایت کی ہو تلوار سیاہ
جس طرح ہاتھ سیہ درہم و دینار سے ہوں
الفتِ زر سے یوں ہی ہے دلِ زردار سیاہ
تیری آنکھوں سے میں تشبیہ نہیں دیتا ہوں
ورنہ ہو جائے ابھی نرگسِ بیمار سیاہ

سینۂ شفاف پیراہن میں پوشیدہ نہیں
ہے نہاں خورشید کا جیبِ سحر میں آئینہ
ہو گیا وہ مست عکسِ چشمِ مے گوں دیکھ کر
ساغرِ مے سے سوا نکلا اثر میں آئینہ

منہ بگڑتا ہی نہیں گانے میں، حیرت ہے مجھے
دائرہ ہے یا کفِ مطرب پسر میں آئینہ

کیا ہی اُس بُت کا بدن شفاف ہے نامِ خُدا
عکسِ گیسو سے ہوا آئینۂ زانو سیاہ

سُننے والے کہتے ہیں، اپنے کیے کی ہے سزا
گر کبھی کرتا ہوں میں جورِ بتِ بدخو سے آہ

سبزہ ہے، گُل ہیں، گھری ہے دونوں پر کالی گھٹا
رنگِ خط ہے سبز، چہرہ سُرخ ہے، گیسو سیاہ

قتل کی فکر رہا کرتی ہے اعدا کو عبث
موت لکھی ہے ہماری اُسی جلاد کے ہاتھ

دیکھی بُلبُل نے جو گُلشن میں کلائی تیری
گُل کی شاخوں کو سمجھنے لگی صیاد کے ہاتھ

کوہِ غم ایک ہی تیشے میں ہوا سو ٹکڑے
کیوں نہ آنکھوں سے لگایا کروں فرہاد کے ہاتھ

کوئی غافل نہیں رہتا کبھی ہُشیار کے ساتھ
بختِ خفتہ ہے مگر دیدۂ بیدار کے ساتھ

ابرو دِ یار رہیں یوں چشمِ سیہ کار کے ساتھ
کھینچے تلواریں ہوں جس طرح گنہ گار کے ساتھ

تیرے ہوتے، مہِ کنعاں کے خریدار ہوئے
گفتگو کون کرے مردُمِ بازار کے ساتھ

چُست ہے رُوح رہِ شوق ہیں، پر سُست ہے جسم
تنگ ہے کیا ہی سبک دوش، گراں بار کے ساتھ

درج مکتوب میں شاید نہیں مضمونِ وصال
ملک الموت بھی ہے قاصدِ دلدار کے ساتھ

تارِ نظر اپنا جو بہ رنگِ رگِ گُل ہے
اُس غیرتِ گلزار پر آج اپنی پڑی آنکھ

ہوں منتظرِ یار، یہ ہے میری تمنا
ہو آٹھ پہر میں بھی نہ بند ایک گھڑی آنکھ

ایسی حیرت کا ہے کو تھی پیش از یں
دیکھ کر تجھ کو، ہوا دنگ آئنہ

واہ کیا عکسِ گُلِ رُخسار ہے
سا لہا رہتا ہے گُل رنگ آئنہ

ہر برگِ گُل کو چوم لیا مثلِ عندلیب
مجھ کو اگر چمن میں ترے یاد آئے ہونٹھ

آیا اگر خیال قدم بوسِ یار کا
پھر وں نہ میں نے نقشِ قدم سے اُٹھائے ہونٹھ

آبِ حیات بن گئی تا تلخ شرابِ صاف
جو اُس نے جامِ آب سے اپنے لگائے ہونٹھ

اے دل ہوست، کشمکشِ کفر و دیں سے چھوٹ
مے خانے بھی بنائے ہیں دیر و حرم کے ساتھ

اہلِ ستم، ستم سے نہ باز آئیں گے کبھی
خوں خواریاں ہیں صورتِ شمشیر، دم کے ساتھ

رہتا ہے روز و شب کی طرح باہم اتّصال
شادی کے ساتھ غم ہے تو شادی ہے غم کے ساتھ

ناسخ! نہ چھوڑیے کبھی راحت میں رنج کو
دوزخ بھی ہم کو چاہیے باغِ ارم کے ساتھ

بے زروں کا بھی کہیں ساتھ کوئی دیتا ہے
جان شیریں نے نہ دی دیکھ لو فرہاد کے ساتھ

جاتا ہے وہ خورشیدِ جہاں تاب جدھر کو
ہے تارِ شعاعی کی طرح اپنی نظر ساتھ

ناسخ! غمِ فرقت میں ہے یہ حال ہمارا
جب کھینچتے ہیں آہ، تو آتا ہے جگر ساتھ

صاف ہے دیوانۂ گیسوے خم دار آئنہ
کیوں نہ ہو زنجیرِ جوہر میں گرفتار آئنہ

حسن سے آگاہ ہو کر، قتل عالم کو کیا
دستِ قاتل میں ہوا شمشیرِ خوں خوار آئنہ

ہے شبِ گیسو میں روشن آئنہ رخسار کا
ہر شبِ تاریک میں ہے ورنہ بے کار آئنہ

دیکھتا ہے نشے کے عالم میں اپنے حُسن کو
ساغرِ مے کو سمجھتا ہے وہ خوں خوار آئنہ

ہیں جو روشن طبع، حُبِّ مال و زر رکھتے نہیں
گھر میں کچھ رکھتا نہیں اسباب زنہار آئنہ

میرے قلبِ باصفا سے جو مُشابہ ہے بہت
مُنہ بنا کر دیکھتا ہے وہ ستم گار آئنہ

سنگ دل سے صاف دل پیدا جو ہو کب ہے محال
اہلِ صنعت سنگ سے کرتے ہیں تیار آئنہ

آج اے ناسخ ہوں میں اسکندرِ مُلکِ سخن
ہیں صفائے لفظ و معنی سے سب اشعار آئنہ

عشق بد ہے، اے دلِ ناداں سمجھ
یہ سند ہے اے دلِ ناداں سمجھ
صبر کر، چُپ رہ، کہ سوزِ داغِ عشق
تا ابد ہے، اے دلِ ناداں سمجھ

حسرتِ انجامِ سکندر کی اگر مجھ سے سُنے
چشمِ جوہر سے ابھی ٹپکائے آنسو آئنہ

عکس تیرا پڑ گیا، رنگت ہوئی گُل برگ کی
ہو گیا مانندِ گُل اے جان، خوشبو آئنہ

ہو گیا ہے عکس تیرا کیا مُسخّر اے پری
سیکھ آیا ہے کسی ساحر سے جادو آئنہ

جس طرف میں دیکھتا ہوں، آپ آتا ہوں نظر
قصرِ ہستی میں لگا رکھا ہے ہر سو آئنہ

صورتِ حالِ دو عالم منعکس ہے دل میں صاف
مُنہ تو دیکھو، یوں بنائے گا ارسطو آئنہ

حیرتی تیرے، کسی کی بات کا کیا دیں جواب
ہو گیا مانندِ طوطی کب سخن گو آئنہ

کر دیا جوہرِ ذاتی کو اِسی نقص نے عیب
عیب پوشی کے ہُنر سے ہے بری آئینہ

اپنی صورت سے بھی نفرت ہے مجھے، غیر تو کیا
میرے آگے نہ کرے جلوہ گری آئینہ

اُس پری چہرہ نے دیکھا ہے مگر مُنہ اپنا
آج آتا ہے نظر مجھ کو پری، آئینہ

کرتے ہیں اہلِ صفا اپنے مربّی کا نام
دے سکندر کو نہ کیوں نام وری آئینہ

تیرے نظّارے سے ہو جاتی ہے کیا خاطر جمع
چھوڑ دیتا ہے پریشاں نظری آئینہ

صباحِ عید ہوئی ساقیا، شراب چلے
نہ پیش تر کہیں ساغر سے آفتاب چلے

گُلوں کی پردہ دری کیا تمھیں ہوئی منظور
جو آج سیرِ گُلستاں کو بے نقاب چلے

چلائیں صورتِ بدمست ٹھوکریں کھاتا
وہ یوں چلے کہ کوئی ساغرِ شراب چلے

وہی عاشق ہے، جو عالم کو مرقّع سمجھے
ہر طرف پیشِ نظر یار کی تصویر رہے

کیفیتیں ہیں یادِ مےِ نابِ وصل کی
آنکھیں نشانی ہیں شبِ مہتابِ وصل کی

کہتا ہے ناز سے، مجھے یوسف نہ جانیے
تعبیر پوچھتا ہوں اگر خوابِ وصل کی

موت بندے کی جو صاحب آپ کو منظور ہے
آج بھی کوئی نہ آنے کا بہانا کیجیے

ہم بیاباں مرگ ہیں، یارو ہماری قبر پر
دامنِ دشتِ جنوں کا شامیانا کیجیے

آب و گِل میں اَڑ گیا ہے توسنِ عمرِ رواں
توڑ کر تارِ نفس کو، تازیانا کیجیے

رات دن غربت میں ناسخ بس یہی رہتی ہے فکر
کوئی خط لکھیے، کوئی قاصد روانا کیجیے

دشتِ غربت میں نگاہ اپنی جدھر جاتی ہے
وہی کوچہ، وہی بازار نظر آتا ہے

یہ بھی اُس ماہ کے کیا میری طرح عاشق ہیں
جو ستارہ ہے، سو بیدار نظر آتا ہے

کیا شکایت، کوئی دشمن ہے اگر تشنۂ خوں
تھا جو غم خوار، سو خوں خوار نظر آتا ہے

جانتا ہوں انھی آنکھوں کو یہ دیکھ آیا ہے
مست جس دم کوئی مے خوار نظر آتا ہے

کیوں نہ خاموشی خوش آوے بلبلِ تصویر کی
لطف کیا، میری طرح جو آہِ بے تاثیر کی

دم میں تیرے پنجۂ سیمیں کو زریں کر دیا
اب حنا کے سامنے ہے خاک قدر اکسیر کی

خواب اس غفلت کدے میں اب جو آتے ہیں نظر
فکر کرنی ہے لحد میں ایک دن تعبیر کی

رگ چلے گلشن میں گر اُس سروِ سیم اندام سے
ہو جھپک موجِ ہوا میں نقرئی زنجیر کی

خاکِ راہِ یار جیتے جی ملے، ممکن نہیں
خاک میں مجھ کو ملا دے گی ہوس اکسیر کی

بعدِ مدت سو گیا ہوں چین سے
یہ جنازہ ہے، دیا گہوارہ ہے

نورِ رُخ سے گیسوؤں کی تیرگی جاتی نہیں
پردۂ ظلمت میں کیا ہو روشنی مہتاب سے

کس قدر شب ہائے فرقت میں ہوا ہے انقلاب
بخت کو ہے اُنس، آنکھوں کو ہے نفرت خواب سے

ہوں تو دیوانہ، دلے کہتا ہوں دانائی کی بات
حلقۂ زنجیر بہتر حلقۂ احباب سے

چھوڑ کر اپنی تعلّی، کر تواضع اختیار
رُتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم محراب سے

اشکِ حسرت، داغِ فرقت، نالۂ گرم، آہِ سرد
لے چلے اسباب ہم یہ عالمِ اسباب سے

تیرے جور و ستم اے عہد شکن بھول گئے
رنج غربت میں یہ پائے کہ وطن بھول گئے

جان کیا مفت گئی صید گہِ عالم میں
نیم جاں کر کے مجھے صید فگن بھول گئے

اس قدر مشق رہی نالہ و افغاں کی ہمیں
یادِ محبوب میں ہم طرزِ سخن بھول گئے

ہے سنہرا رنگ اُس میں کیا سونے کا رنگ
تیرے بازو پر صنم ہیرے کی جوشن چاہیے

میں تو عریاں، دستِ وحشت کو گریباں کی طلب
ہے زبانِ خارِ صحرا پر کہ دامن چاہیے

کوچۂ قاتل کو بھاگوں، صحبتِ احباب سے
دوستوں کو کیا کروں میں، مجھ کو دشمن چاہیے

صحرا میں دیکھتا ہوں جو شوخی غزال کی
آتی ہے یاد اک صنمِ خُردسال کی

معنی یہ ہیں کہ باغ میں ہم مے کشی کریں
جنّت میں جو شراب خدا نے حلال کی

گُلگُونِ یار کی ہیں یہ رنگیں خرامیاں
پائی غُبارِ راہ نے رنگت گُلال کی

افسوں ہے بولنے میں، تو چلنے میں سحر ہے
ہو گی پری بھی کوئی نہ اِس بول چال کی

دورکی تسبیح میں نے جب، ملا جامِ شراب
آفتاب اے مے کشو آیا تو بس اختر چلے

مے کشی کے باب میں ناسخ جنابِ دَرد سے
سُن لے مصرع: جب تلک بس چلے سکے، ساغر چلے

یک بہ یک عشق سے کیوں کر ہو مرا دل خالی
کہ بدن، جان سے ہوتا ہے بہ مُشکل خالی

نفع پر دردۂ آغوش سے پایا کس نے
موتیوں سے نہ ہو کیوں دامنِ ساحل خالی

یاد آیا مجھے کیا مصرعِ گرم اے ناسخ
نفسِ سرد بھروں، تو بھی نہ ہو دل خالی

جلوہ گر خلوتِ دل میں ہے مرا یار مدام
کبھی ہوتا نہیں لیلا سے یہ محمل خالی
راہ رَو روز اُترتے ہی چلے جاتے ہیں
کبھی مجھ کو نظر آئی نہ یہ منزل خالی

سرو کو اُس قدِ موزوں سے بھلا کیا نسبت
کہ معانی سے ہے یہ مصرعِ مہمل خالی
اس خرابے میں نہیں ہے کوئی دو دن آباد
آج معمور جو ہیں، ہوں گے وہ گھر کل خالی

دل مُلکِ انگریز میں جینے سے تنگ ہے
رہنا بدن میں روح کو قیدِ فرنگ ہے
خوں ہو گیا جو غم سے دل اپنا، تو جھے ہم
شیشے میں آج بادۂ یاقوت رنگ ہے

ہے بے صفا، جو کوئی گرفتارِ رنگ ہے
خورشید آئنہ ہے، شفق مثلِ زنگ ہے
حاضر ہے قتل ہونے کو ناسخ بھی مثلِ درد
گر نامِ عاشقی ترے نزدیک ننگ ہے

دیکھنا تاثیر میرے نالۂ جاں کاہ کی
سُن کے اُس بے رحم نے بے اختیار اک آہ کی

اوّل و آخر ہے یکساں، بیچ کا کیا اعتبار
ہے حقیقت ایک نظروں میں گدا و شاہ کی

جائے عبرت ہے، بجا کر پانو رکھو اے باغباں
تو نے سرسبزی کبھی دیکھی ہے برگِ کاہ کی

مسکنِ شاہدِ شرابی ہے ۔۔۔ کعبۂ دل کی اب خرابی ہے
جامِ مے کیوں بہ رنگِ گُل نہ ہنسے ۔۔۔ دستِ ساقی میں اب گُلابی ہے

موت کی بھی راہ میں کیا پھیر ہے ۔۔۔ مثلِ قاصد آنے میں جو دیر ہے

عشق جب کامل ہوا ہے عینِ حُسن ۔۔۔ آگ میں پڑ جائے جو شے، آگ ہے
دیتی ہے فوجِ فنا پیہم شکست ۔۔۔ لشکرِ ہستی میں بھاگا بھاگ ہے
جانتے ہیں جس کو سب تارِ نفس ۔۔۔ توسنِ عمرِ رواں کی باگ ہے

نامہ بر ہے، نامۂ احباب ہے ۔۔۔ ہائے بیداری ہے یہ یا خواب ہے
رو رہا ہوں کیا اُجڑ آباد میں ۔۔۔ دائرہ جو ہے یہاں، گرداب ہے
قاصدا! پُرزے اُٹھالے جیب کے ۔۔۔ یہ جوابِ نامۂ احباب ہے

یاں ہنسی لب پہ ہے، دل میں درد ہے ۔۔۔ راز رکھتا ہے نہاں جو مرد ہے

فصلِ گُل ہے، کیوں نہ ہو ہم پر بہار　　سُرخ آنسو ہیں تو چہرہ زرد ہے

کھوئے جب آپ کو، ملے محبوب　　گُم ہوئے، تب یہ بات پائی ہے
دیکھنا اے سحابِ دیدۂ تر!　　کیا بگولوں نے خاک اُڑائی ہے
لے چلی ہے وطن سے وحشت دور　　بارے نزدیک موت آئی ہے
یا ملا اُس کے ہاتھ سے قاصد؟　　خط کا سرنامہ کیوں حنائی ہے
موت آئی نہیں ہے پیری میں　　صُبح دم مجھ کو نیند آئی ہے
ہر گلی میں ہیں سائلِ دیدار　　آنکھ، یاں کاسۂ گدائی ہے

دور ہو غربت! وطن نزدیک ہے
مُرغِ جاں خوش ہو، چمن نزدیک ہے

ہے شکستہ گر عقیقِ دل تو کیا
اور لے لیں گے، یمن نزدیک ہے

خندۂ دنداں نمائے یار دیکھ
لکھنؤ کیسا، عدن نزدیک ہے

دُور سے آواز آتی ہے مجھے
آج بوئے پیرہن نزدیک ہے

مثلِ انجم روزنِ دیوار ہیں
اُس پری کی انجمن نزدیک ہے

خود بہ خود خُم میں جو ہے جوشِ شراب
ساقیِ پیماں شکن نزدیک ہے

جوئے اشک آنکھوں سے جاری ہے یہاں
کیا مزارِ کوہ کن نزدیک ہے؟

جب سے ہے پنہاں نظر سے عیش باغ
چشمِ گوہر بار، موتی جھیل ہے

یوسفِ ثانی جو ہے وہ خود فروش
کانپور ہے مصر، گنگا نیل ہے

موذی اپنے مال سے بھی منتفع ہوتے نہیں
موم سے کیا روشنی ہو خانۂ زنبور کی

کیا برستی ہے بجائے ابرِ رحمت بے کسی
ہے یہی تربت مقرّر ناسخِ مغفور کی

آ گئے ہیں کس قدر ہم بھی فریبِ عشق میں
بُت کو اک مُدت تلک سمجھا کیے، اللہ ہے

کیا عجب اس کا اگر بھولا ہوں میں راہِ وطن
یادِ غربت میں مجھے جورِ بُتِ گم راہ ہے

کیا تنزّل میں ترقّی ہو گئی ناسخ مجھے
گر نہیں دربار تو اللہ کی درگاہ ہے

میں نہ فریادی بُتوں کا ہوں خدا کے سامنے
آشنا کا کیا گلہ نا آشنا کے سامنے

جسم چھوٹا روح سے، دل سے نہ چھوٹا وہ صنم
بُت بغل میں لے چلے ہیں ہم خدا کے سامنے
دیکھ کر قبروں کو اے دل کوچ اپنا یاد کر
سب یہ گویا میل ہیں راہِ فنا کے، سامنے

تھوڑے کانٹے چُن کے رکھ دو، ہم بیاباں مرگ ہیں
کیا ہماری قبر پر پھولوں کی چادر چاہیے
اپنے دل میں دونوں رکھتے ہیں برابر مجھ کو یاد
ہو سکے تو دوست دشمن کو برابر چاہیے
تھوڑے سے کانٹے بیاباں میں بچھا دے اے جنوں
میرے پائے خواب آلودہ کو بستر چاہیے
بھیج ناسخ لکھ کے یہ اشعار سوے لکھنؤ
طائرِ معنی کو اب کاغذ کا شہپر چاہیے

تنگیِ عالمِ امکاں کی یہ قاطع ہے دلیل
آئے دو چار جو اِس میں، وہیں دو چار چلے
ہر قدم پر ہے مجھے یوں رہِ دیں میں لغزش
لڑکھڑاتا ہوا جیسے کوئی مے خوار چلے

کب قابلِ علاج محبت کا داغ ہے
دل خانۂ خدا ہے، یہ اُس میں چراغ ہے

ہم رندِ بادہ خوار ہیں، کوئی گدا نہیں
کیوں ساقی، اپنے ہاتھ میں خالی ایاغ ہے

دلیلِ عقل ہے وارستگی بندِ علائق سے
کہ سودائی جہاں میں قابلِ طوق و سلاسل ہے

مصرعِ ثانی لگا دے کوئی زیرِ آسماں
ماہِ نو یہ ایک اُس کا مصرعِ برجستہ ہے

کوششِ اخفا عبث ہے، فاش ہوگا خلق میں
رازِ دل ناسخ! شرابِ شیشۂ بشکستہ ہے

چلتے چلتے دشتِ غربت میں یہ تلووں کا ہے حال
ملتے ملتے جو ہوئی حالت کفِ افسوس کی

سوچ اے منعم! عمارت کا تو ہے مذکور کیا
گور بھی ملتی نہیں دنیا میں کیکاؤس کی

دوست جب سے اک برہمن زادہ ہے
دل ہمارا کفر پر آمادہ ہے

ترک کرتا ہے عشقِ سادہ رو
زاہدِ بے دیں بھی کتنا سادہ ہے

جس کی مسجد پر نہ پڑتی تھی نگاہ
وہ درِ بت خانہ پر افتادہ ہے

زاہدا! میں کیا کروں ظرفِ وضو
دوشِ ساقی پر سبوئے بادہ ہے

رشتۂ زنار جو ہے تا کمر
بس یہی راہِ عدم کا جادہ ہے

معتکف رہتا ہوں کعبے میں، تو کیا
دل تو اے ناسخؔ، مقیمِ دیر ہے

کمال آپ کے جلوے سے بام روشن ہے
بہ رنگِ مطلعِ ماہِ تمام روشن ہے
شبِ فراق گئی، روزِ وصل آپہنچا
طلوعِ صبح ہے، عالم تمام روشن ہے

قلزمِ دہر میں رکھتا ہے تجرّد محفوظ
غرق کم ہوتا ہے دریا میں سفینا خالی
کبھی ہو گی نہ یہاں گنجِ معانی کی کمی
ورنہ ہو صرف سے قاروں کا خزینا خالی
ایک کے نفع سے ہے ایک کو نقصان یہاں
جام بھر جائے جو ساقی تو ہو مینا خالی

اپنے غنچے کو موافق نہ ہوئی بادِ چمن
آئے دل گیر ترے کوچے میں دل گیر چلے

حسرتِ اقبال میں ہم خانہ ویراں ہو گئے
جس قدر کی دھوم نے جلدی، ہما نے دیر کی

شبِ تاریک ہے، پر نور گلیوں میں برستا ہے
ہوا ثابت یہی کاشانۂ جاناں کا رستا ہے

جو واقف نرخِ بازارِ محبت سے ہیں، کہتے ہیں
کوئی دل نقدِ جاں دے کر جو ہاتھ آئے تو سستا ہے

بدن میں جان ہے جب تک، نہ پہنچوں گا نہ پہنچوں گا
عدم تک کا اور قاتل کی گلی کا ایک رستا ہے

عشق تو مدت سے اے ناسخ نہیں
مجھ کو اپنی بات کا اب پاس ہے

پہروں ہی بات مرے مُنہ سے نکل سکتی نہیں
یاد آجاتی ہے تیری جو کوئی بات مجھے

کلمہ گوئی سے تو معذور رکھ اے زاہدِ شہر
نفی کے قبل بھلا حاصلِ اثبات مجھے!

جتنے ادنا ہیں، سمجھتا ہوں میں اعلا ناسخ
صاف خورشید نظر آتے ہیں ذرّات مجھے

رحم آئے غیر کو، لیکن نہ آئے یار کو
دوست مجھ کو قتل کر ڈالے، جو دشمن چھوڑ دے

یک قلم لکھے ہیں ناسخ اُس گُلِ رعنا کے وصف
جو مرا دیوان دیکھے، سیرِ گلشن چھوڑ دے

پڑھ کے خط اُس بے وفا نے، جو نہ کہنا تھا کہا
آنکھ کر سکتا نہیں میں نامہ بر کے سامنے

پہلی منزل گور اُس میں، اِس میں منزل ہی نہیں
کیا ہے دنیا سے سفر، میرے سفر کے سامنے

جنوں پسند مجھے چھانو ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے اِن زرد زرد پھولوں کی
اگرچہ آئی ہے برسات، پھول پھولے ہیں
ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی
کہاں اُمید ترقّی کی جیتے جی ہم کو
یہ مُشتِ خاک ہے بس منتظر بگولوں کی

باغِ ہستی میں ہمیں بس نخلِ ماتم چاہیے
دے خوشی اوروں کو او گردوں، ہمیں غم چاہیے
ہے بہت کچھ دینے کو ہر چند حاضر آسماں
پر کرے کیا، میں ہی کہتا ہوں، مجھے کم چاہیے

طمع نہیں مجھے ہرگز کہ سیم و زر مل جائے
کسی طرح سے الٰہی! وہ سیم بر مل جائے
نکل چلا ہوں کہ اُس کی کہیں خبر مِل جائے
خدا کرے مجھے رستے میں نامہ بر مِل جائے
بلائے جاں ہے، نظر سے اگر نظر مِل جائے
مگر ہے لطف بڑا، دل سے دل اگر مل جائے

خوشی کے مارے کہوں، آج مجھ کو خضر ملے
جو راہِ کوچۂ جاناں کا راہ بر مل جائے

کیا ہی چاکِ قبا ہیں خوش اسلوب
میری وحشت کی دست کاری ہے
جام سے چشمِ یار یاد آئی
ہم کو مستی میں ہوشیاری ہے
اِن دنوں ہے غضب جنوں ناسخ
مجھ کو غیروں سے چشمِ یاری ہے

ہر کہیں شیشے، تو جام خالی ہے
گردشِ آسماں نرالی ہے
سفلوں سے پوچھتا ہوں غربت میں
کہیے کیسا مزاجِ عالی ہے
نورِ مہتاب ہے دھوئیں کی طرح
ہائے کیا آج رات کالی ہے
واعظا، ہو نہ درپئے ناسخ
عاشق و رندِ لاابالی ہے

گو کبھی دیکھا نہیں میں نے تجھے اے گُل مگر
ہر طرف سے آئی اِس گلشن میں تیری بُو مجھے

دم میں تسخیر اے پری زادو جسے چاہوں کروں
شعر تم ان کو نہ جانو، یاد ہیں جادو مجھے

باغ میں آوازِ چاکِ جیبِ گُل
صاف ہم دیوانوں پر آوازہ ہے
پیٹ کا بھرنا تو کچھ مشکل نہیں
کیجیے کیا، حرص بے اندازہ ہے

موت ہے نزدیک مجھ سے کوے قاتل دور ہے
پاس آپہنچا ہے رہ زن، اور منزل دور ہے

آسماں نشۂ رفعت سے یہ بہکا کہ مجھے
ساغرِ مے کے عوض، دیدۂ تر دیتا ہے
کرے ہم بادہ پرستوں کو خدا کیا مفلس
جام کے ساتھ کفِ گُل میں بھی زر دیتا ہے
سائلِ مے کوئی ہوتا ہے اگر اے ناسخ
ساغرِ عمر کو گردوں وہیں بھر دیتا ہے

وہ ہے پاس جس کو دلا چاہتا ہے
تڑپتا ہے کیوں، اور کیا چاہتا ہے
بُتوں سے محبت نہیں مجھ کو از خود
کہ ہوتا ہے وہ جو خدا چاہتا ہے
ہوا مشتعل بے طرح عکس تیرا
اب آئینے کا گھر جلا چاہتا ہے

دل اک بُت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے
گزر اُس پری کا ہے اکثر چمن میں

جنوں! ضعف اگر یوں ہی زنجیر پا ہے
تو زنداں ہی صحرا ہوا چاہتا ہے

مےِ عشرت سے کوئی جام جو بھر لیتا ہے
آسماں اُس کا وہیں کاسۂ سر لیتا ہے
غیر کا کچھ نہ چلے گر نہ ہو دشمن اپنا
چوب دستی کو شجر ہی سے تبر لیتا ہے
پھر گیا ہے اُدھر اُلٹا کوئی آتے آتے
سانس اُلٹی دلِ بے تاب اِدھر لیتا ہے

نہ کر سکا میں کوئی کام حسبِ خواہشِ دل
سوائے جبر نہیں خاک اختیار مجھے
جنوں رہا، گُلِ داغِ جنوں شگفتہ رہے
تمام عُمر رہا موسمِ بہار مجھے
میں فاقہ مست خراباتِ دہر میں ہوں مگر
حریف جانتے ہیں رندِ بادہ خوار مجھے

کس طرح پاؤں خبر میں، کوئے جاناں دُور ہے
نکہتِ گُل آ نہیں سکتی، گلستاں دُور ہے
آرزوئے بوسۂ لب میں ہوا ہوں جاں بہ لب
موت آ پہنچی ہے نزدیک، آبِ حیواں دُور ہے

ہم سفر وہ ہے جس پہ جی غش ہے
دشتِ غربت مقامِ اتش اتش ہے

دیکھو اعجازِ پیرِ بادہ فروش
ایک جا جمع آب و آتش ہے

بنتی ہے گرد باد خاک اُس کی
اس خرابے میں جو کہ سرکش ہے

بہرِ غم داغ ہائے حسرت سے
خانۂ دل مرا منقّش ہے

او بہار! امسال دل پژمردہ ہے
داغِ سودا بھی چراغِ مُردہ ہے

دم بہ دم اُٹھتے چلے جاتے ہیں لوگ
دہر گویا بزمِ برہم خوردہ ہے

تو ہی بھڑکائے گی اے بادِ بہار
دل ہمارا آتشِ افسردہ ہے

دیکھتا ہوں باغ میں، غنچہ اگر
جانتا ہوں، نامۂ پیچیدہ ہے

کون اے بُت ہے تو، خدا جانے
کفر کیا شے ہے، کوئی کیا جانے

دل کو پوچھا جو میں نے، وہ بولے
کہیں ہوگا، مری بلا جانے

ایک ہی ہیں خُدا و بُت، زاہد!
وہی مُشرک ہے جو جُدا جانے

کشتی اُس کی نہ ڈوبے صورتِ موج
جو کہ طوفاں کو ناخُدا جانے

عشق ہے خوب شغل، سمجھے ہم
کوئی اُس کو نہ جانے یا جانے

رو دے اگر نہ یار، تو ہنس دے نہ سُن کے غیر
اتنی ہماری آہ کو تاثیر چاہیے

آرام خوش قدوں سے کوئی پائے، ہے محال
جُز سرو، بیٹھتے ہیں سب اشجار کے تلے
نقشِ جبیں ہے ناسخِ طاعت گزار کا
نقشِ قدم نہیں قدمِ یار کے تلے

لاکھوں ہی نامور، ہوئے دُنیا میں بے نشاں
اک گور میں ہیں کتنے سکندر بھرے ہوئے
بازیچۂ جہاں کو تو شطرنج ہی سمجھ
خالی ہیں کوئی دم میں دلا، گھر بھرے ہوئے
اُس خطِ سبز روے کتابی کے وصف میں
ناسخ، ہمارے پاس ہیں دفتر بھرے ہوئے

رنج کیوں بادہ پرستو! ہے تہی دستی کا
بھر بھی جاتے ہیں، جو ہو جاتے ہیں ساغر خالی
گر چھلکتا ہے چھلکنے دے مرا ساغرِ عمر
جامِ مے، دیکھو ساقی، نہ ہو دم بھر خالی

عمرِ جاوید زر و زور سے کب ملتی ہے
آبِ حیواں سے رہا جامِ سکندر خالی

آمد آمد ہے ترے یار کی اب اے ناسخ
جلد اغیار سے کاشانۂ دل کر خالی

کر چکا ہوں صرف سب گنجِ مضامینِ بلند
عرش کے دروازے کا اب قفل توڑا چاہیے

دشتِ وحشت میں کہاں ہوش و حواس و عقل و دیں
اے جنوں! اس قافلے کا ساتھ چھوڑا چاہیے

ہم کہیں کو جاتے ہیں، کہتی ہے دُنیا کی ہوس
توسنِ عمرِ رواں کی باگ موڑا چاہیے

کر گیا وحشت دہ، تیری بے قراری دیکھ کر
عشق میں ناسخ، بشر کو ضبط تھوڑا چاہیے

تھا شبِ فرقت میں کیا تاریک ویرانہ مرا
سایے کے مانند اُتری چاندنی دیوار سے

کام کچھ بھی دیدۂ بیدار سے نکلا نہیں
دولتِ بیدار ملتی ہے دلِ بیدار سے

مے کشو! سیدھے وہ مسجد کو نہ جائیں کیا کریں
جو کہ ناواقف ہیں راہِ خانۂ خمار سے

چور کیا ناسخ میں دُزدانِ معانی کو کہوں
پھول لے جاتے ہیں گُل چیں گلشنِ اشعار سے

کیا آج چمکتے ہیں جنوں! آبلۂ پا
دریا کے نہیں، ہیں یہ بیابان کے موتی

بزمِ غمِ شبّیر میں گرتے ہیں جو آنسو
زیبا ہے، کہیں ہم انھیں ایمان کے موتی

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے
تمام رات چراغوں سے اپنے داغ جلے

فراقِ یار میں فصلِ بہار آئی ہے
الٰہی! آتشِ گُل سے تمام باغ جلے

موا ہوں میں شبِ تارِ فراق میں ناسخ
یقین ہے، نہ مری قبر پر چراغ جلے

کی میں نے جو غم سے سینہ کوبی
نوبت یہ صُبح کی بجی ہے

قد ہے اُتنا ہی راست اُس کا
رفتار میں جس قدر کجی ہے

ناسخ! یہ فصاحت و بلاغت
گویا سلمانِ ساوجی ہے

پھر بہار آئی چمن میں، زخمِ گُل آلے ہوئے
پھر مرے داغِ جنوں، آتش کے پرکالے ہوئے

واہ کیا تاثیر ہے رُخسارِ آتش ناک کی
شعلۂ جوّالہ تیرے کان کے بالے ہوئے
وہ پری پیکر کہا کرتا ہے اکثر فخر سے
اب تو ناسخ بھی ہمارے چاہنے والے ہوئے

خاکساری بھی نہ چھوڑے دے خُدا جس کو عروج
آسماں پر ماہِ تاباں ہے، زمیں پر چاندنی
بھول کر او چاند کے ٹکڑے، اِدھر آ جا کبھی
میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی
ایک ہفتے سے بہم ساتوں میسّر ہیں مجھے
دشت، دریا، سبزہ، ساقی، شیشہ، ساغر، چاندنی
کیا شبِ مہتاب میں بے یار جاؤں باغ کو
سارے پتّوں کو بنا دیتی ہے خنجر چاندنی
دل سیہ ہے، بال سب اپنے ہیں پیری میں سفید
گھر کے اندر ہے اندھیرا اور باہر چاندنی
دشتِ غربت میں ہوں بے اسباب اور آتی ہے رات
جلد او گردوں بچھا دے بہرِ بستر چاندنی
نقرئی موباف اُس کافر کی چوٹی میں نہیں
یہ وہ شب ہے جس نے کر لی ہے مسخّر چاندنی

چمنِ دہر میں ایسا ہو یہ گُل بالیدہ　　جسم پر غنچہ صفت تنگ قبا ہو جاوے

آتی جاتی ہے جا بہ جا بدلی ساقیا جلد آ، ہوا بدلی
آگے تھی گرد آب ہے بوئے سمن تو نے پوشاک اے صبا، بدلی
برگِ تر آئے، برگِ خشک گرے ہر شجر نے بھی اب قبا بدلی
رنگ چہرے کے یاں بدلنے لگے آنکھ تیری جہاں ذرا بدلی
رندِ مے خوار جب پکارتے ہیں
دور سے دیتی ہے صدا بدلی

عبث خانہ برباد ہو ہرزہ گردو! جو بیٹھا ہے گھر میں، وہی کو بہ کو ہے
تصور جو ہے دَرد کی طرح ناسخ جدھر دیکھتا ہوں، وہی رُو بہ رُو ہے

چشمِ کم سے خاکساری کے نہ مضمونوں کو دیکھ
یہ نہیں اشعار میرے، نسخے ہیں اکسیر کے

کرتے ہو اہلِ زمیں پر ظلم مثلِ آسماں
نوجوانو! ہو گئے ہو کیا مُرید اِس پیر کے

کس کو کہتے ہیں خُدا جانے تجلّی اے کلیم
صاعقے گرتے ہیں مجھ پر آہِ بے تاثیر کے

ہم کو بھولیں گے نہ دُنیا کے تماشے بعدِ مرگ
یاد بیداری میں آئیں گی یہ باتیں خواب کی

یوں تو ہر کوئی ہے یاں غوّاص بحرِ فکر میں
جُستجو مجھ کو ہے لیکن گوہرِ نایاب کی

وادیِ غربت میں نا سخ ہے وطن میرے حضور
خود فراموشی میں بھی ہے مجھ کو یاد احباب کی

نیمچے ہیں، شعر وصفِ ابروِ خم دار کے
حرف بھی، لکھتے ہی، جوہر بن گئے تلوار کے
کیا خزاں پاس آسکے تیرے گُلِ رخسار کے
پھول کُمھلاتے نہیں ہرگز گلے کے ہار کے
کیا ہی مُرجھائے ہیں اُس خورشید رُو کے سامنے
داغ ہائے ہجر، گویا پھول ہیں گُلزار کے

دم بھر رہِ وطن میں نہ لینا کہیں قرار
قاصد! تجھے قسم ہے مرے اضطراب کی
حد سے زیادہ تجھ میں نزاکت ہے بحرِ حُسن!
انگیا کو چاہیے ہے کٹوری حباب کی
اُس مست کے دہن کو جو غنچے سے دوں مثال
آنے لگے گُلاب سے بھی بو شراب کی

راہ میں نقشِ قدم، تصویر آتے ہیں نظر
پائے جاناں میں ردش ہے خامۂ بہزاد کی
زادہ ہائے طبع کی کثرت ہوئی ہے اس قدر
ہم نے اک بستی زمینِ شعر میں آباد کی

بُت نے مارا ہے جو مجھ کو، تھی یہ تقدیرِ خدا
حکمِ حاکم تھا شکایت کیا کروں جلاّد کی

ہے الف سا قد تصوّر میں یہاں آٹھوں پہر
دل ہمارا ہے کہ پیشانی کسی آزاد کی

اپنے اپنے بخت، یوسف کو زلیخا مول لے
جانِ شیریں مفت میں جاتی رہے فرہاد کی

یار کے در تک رقیب آتے ہی مرجائے شتاب
یا الٰہی! موت اُس کو بھی ملے شدّاد کی

کُنجِ غربت میں ہے جز غم خاک، ناسخ! ہاں مگر
خط کوئی آیا کبھی، پڑھ کر طبیعت شاد کی

صُبح اب کرتے ہیں ہم کس مشغلے میں دیکھیے
روتے روتے انتظارِ نامہ بر میں شام کی

ہوتی جاتی ہے خطِ شب رنگ کی ہر جا نمود
روشنی ہے روے جاناں میں چراغِ شام کی

حُبِّ زر ہر چند اے ناسخ نہیں مجھ کو، مگر
رات دن ہے یاد اک محبوبِ سیم اندام کی

شُعاعِ عارضِ دل دار کا یہ عالم ہے
کہ آفتاب ہے گویا نقاب کے بدلے

حُصولِ علم سے کیا ہو، جو ہے سو قسمت ہے
میں سر نوشت پڑھوں اب کتاب کے بدلے

جو آرزو ہے دلا ہاتھ آئے صیدِ مُراد
تو چاہیے ہے سکوں، اضطراب کے بدلے

اُس طرف سے اب ستم ہیں، اِس طرف سے ہیں گلے
ہوگئیں موقوف وہ باتیں نیاز و ناز کی

ہنستے ہو تُم کے مرا حال کہاں تک دیکھوں
بے رُلائے کوئی یہ مرثیہ خواں اُٹھتا ہے
کب اجل کو ہے بھلا پیر و جواں میں تمیز
ہر کوئی دہر سے اے پیر و جواں اُٹھتا ہے
میری نظروں میں ہوا عرصۂ دُنیا تاریک
کیا غُبارِ فرسِ عُمرِ رواں اُٹھتا ہے

روٹھے ہوئے تھے آپ کئی دن سے، مَن گئے
بگڑے ہوئے تمام مرے کام بن گئے
جی کیوں لگی رہے نہ بھلا مجھ کو رات دن
کیا کیا جہان سے نہ مرے ہم سخن گئے

آپ ہیں دوست تو دشمن کیا ہے
خضر ہم راہ ہے، رہ زن کیا ہے
بُرشِ تیغ قضا کے آگے
سرکشوں کی رگِ گردن کیا ہے
آپ کا دام بلا آفت ہے
طائرِ عرش نشیمن کیا ہے

خاک میں مل جائے ایسا ہی اکھاڑا چاہیے
لڑ کے کُشتی، دلو ہستی کو پچھاڑا چاہیے
کوئی سیدھی بات صاحب کی نظر آتی نہیں
آپ کی پوشاک کو کپڑا بھی آڑا چاہیے

نظر آئی ضریحِ تربتِ شبّیر، لوہے کی
زیادہ سیم و زر سے ہو گئی توقیر لوہے کی

بچے اے غافلو، سیلِ حوادث سے نہیں ممکن
کرو بالفرض اگر دولت سرا تعمیر لوہے کی

مجھے ٹھوکر نہ مارے چومے قبضہ تیغ کا قاتل
مری تقدیر کیا، دیکھو ہے کیا تقدیر لوہے کی

اثر درکار ہے تو جا پہنچ عرشِ معلّا تک
نہیں سقفِ فلک اے نالۂ شب گیر لوہے کی

ہر اک اعلیٰ ہے اپنے حفظ میں محتاج ادنیٰ کا
درِ گنجینۂ زر میں لگی زنجیر لوہے کی

بُرش کب تیغِ ابرو کی ملی تیغ مہِ نو کو
کہاں شمشیر چاندی کی کہاں شمشیر لوہے کی

کہاں کا زر، بُرے وقت اہلِ جوہر کام آتے ہیں
کوئی زردار بنواتا نہیں تلوار سونے کی

ہوا ہے حسرتِ زر میں تہتو مس، کیا مناسب ہو
اگر لگوائیں اینٹیں قبر میں دو چار سونے کی

اجل کے آتے ہی سونا پڑا ہے خاک میں غافل
بس اک دم میں مسہری ہوگئی بے کار سونے کی

نہیں تلوار کی حاجت، جو دشمن ہو، اُسے زر دے
زیادہ ہوتی ہے لوہے سے اے دل، مار سونے کی

سفید آگے ترے چاند، اور سورج زرد ہے ظالم
یہ ہے اکسیر سونے کی، وہ ہے اکسیر چاندی کی

بہت اُس سیم تن کی مدح کے مضمون سوجھے ہیں
مجھے درکار ہیں لوحیں پئے تحریر، چاندی کی

کسی سیمیں بدن کا دیکھنے والا ہوں اے ناسخ
کروں کیوں کر نہ میں ہر بات میں تحقیر چاندی کی

خندہ زن مانندِ گُل ہوں رنگ کی آواز سے
باغِ عالم میں ہو کون آگاہ میرے راز سے

جب کوئی مطرب بجاتا ہے مرے اشعارِ گرم
ساز کے جلتے ہیں پردے شعلۂ آواز سے

ہے بہ رنگِ طائرِ تصویر تیرے ہاتھ میں
طائرِ رنگِ حنا واقف نہیں پرواز سے

طُرفہ عاشق ہوں، مرا معشوق کیا جانے ہے کون
اور تو کیا، خود نہیں واقف میں اپنے راز سے

کوئی جُز معشوق، عاشق کے تصور میں نہیں
ہو اگر مجنوں تو پھر لیلا ہی ہر محمل میں ہے

وہ یارِ ہم پیالہ، وہ ساقی، وہ مے کہاں
سب اپنی مے کشی کے قرینے گزر گئے

پوچھا جو رد کے یار نے ناسخ کے حال کو
ہنس کر کہا رقیبِ شقی نے : گزر گئے

سب زمینیں ہیں نئی، بندشیں ہیں اے یار نئی
روز یاں ریختے کی اُٹھتی ہے دیوار نئی

بول چال ایسی کسی کی بھی نہیں دُنیا میں
تیری گفتار نئی ہے، تری رفتار نئی

کب جوانی میں ہے؛ پیری میں جو کیفیت ہے
مےِ کہنہ کے برابر نہیں زنہار نئی

پوچھیے اِن سے، کفن کو بھی بدل سکیے گا!
روز پوشاک پہنتے ہیں جو سردار نئی

نہیں ممکن کہ نئی ساری غزل ہو ناسخ!
باتیں دو چار پُرانی ہیں تو دو چار نئی

تو چاند ہے، سایہ چاندنی ہے کوسوں تک بلکہ روشنی ہے
دیکھا جسے، ہوگیا وہ عاشق تیری آنکھوں میں موہنی ہے

کیوں کر پی جاؤں دیکھ اے ضبط   جو اشک ہے، ہیرے کی کنی ہے
جلتے ہیں داغِ یاس دل میں   ہر شب اِس گھر میں روشنی ہے
ناسخ! جو فقیر ہوں، نہیں غم
میرا اللہ تو غنی ہے

بیلے کی نظر آگئیں کلیاں گُلِ تر میں
ہنسنے میں جو کل دانت تمہارے نکل آئے

دیتا ہے کہاں ساتھ بُرے وقت میں کوئی
پتھر کو لگی چوٹ شرارے نکل آئے

اے عندلیبِ شوخ، تو رہ آشنائے گُل
مجھ کو چمن سے سبزۂ بے گانہ چاہیے

دیکھو مستو! طلسم بادہ فروش
آگ بھی ہے شراب، آب بھی ہے

کیا کریں، باغ سے آئے جو ہوا کے جھونکے
آ رہے ہیں یہ ہمیں خوابِ فنا کے جھونکے

کوہِ تمکیں بھی اُڑے پھرتے ہیں مثلِ پرِ کاہ
چلنے لگتے ہیں جہاں بادِ فنا کے جھونکے

وسعت آبادِ جہاں تنگ ہوا زیرِ فلک
چاہیے مجھ کو جگہ زیرِ زمیں تھوڑی سی

تیرے ہی نام کی اے جان ہے بس گنجایش
وسعتِ دل بھی ہے مانندِ نگیں تھوڑی سی

کیا پہنچ ہے تری دہلیز تک اے ماہ جبیں!
چاند کی روز جو گھستی ہے جبیں تھوڑی سی

غُرّۂ ماہِ مبارک ہے یہ دیں داروں کا
پی شراب آج تو اے دشمنِ دیں تھوڑی سی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ: شائستہ خان	۷۵/
سمیری اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۷۵/
جامِ جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گربچن چندن	۷۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(تاریخ)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۶۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایلوپیتھی)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
بہ صورت گرِ کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن)	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ)	〃	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز (اردو نظمیں)	(شعری مجموعہ)	〃	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے ہیں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبد السلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبد المغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/